U83451 Date 5-1-10

Title - MAQASIDUL ISLAM.

Creator - Mohd. wali uddin faruqi.

Publisher - Matba Qanooni Press (Hyderabad).

Date - 1334 H.

Pages - 296.

Subjects - Islam - Akhlaqiyaat; Islam - Aqayad-o-Iman; Islam - Taleemaat; Islam - Tasawwuf.

سلسلہ اشاعۃ العلوم نمبر ۵

إن الدين عند الله الإسلام

از افادات حقائق آگاہ معارف دستگاہ عارف باللہ مولانا مولوی حاجی حافظ

حضرت محمد انوار اللہ خان بہادر معین المہام امور مذہبی ممالک محروسہ سرکار عالی

حصہ ہشتم

مقاصد الاسلام

باہتمام

ابوالدرجات مولانا مولوی حافظ محمد ولی الدین صاحب فاروقی الامدادی مہتمم اشاعۃ العلوم حیدرآباد دکن

در مطبع قانونی پریس حیدرآباد دکن طبع شد

۱۳۳۴ھ

دفعہ اول — مجلد — [illegible] فی جلد

فہرست مضامین مقاصد الاسلام حصہ ہشتم

صحتنامہ مقاصد الاسلام حصہ ہشتم

غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر
ماتیلفظ	مایتلفظ	۴۲	۱۷	فرماتے	فرماتے ہیں	۱۴۴	۱۵
ہوالذی	ان اللہ	۵۴	۱۶	قسم	قسم کا	۲۲۹	۹
عبادی	عبدی	۶۰	۵	شخص	شخص ہوسے	۲۲۷	۱۲
نے	×	۶۹	۲	غرض نے	غرض سے	۲۲۹	۷
شاہدہ	مشاہدہ	؍؍	۱۰	لڑنے کی	لڑکی	۲۳۵	۲
تنہا	انتہا	۷۷	۱۱	بھکت	بھگت	۲۴۱	۱۶
ان کی	اس کا	۸۳	۱۴	حس	حسن	۲۴۸	۵
غنی	الغنی	۱۰۶	۵	حسن نے اون سے	حسن نے اون کو	؍؍	۱۲
ایسا	ایسے	۱۱۷	۱۷	سر سے پاون کو	سر سے پاؤں تک	۲۶۵	۱
انقادا	انقاد	۱۲۶	۹	اورکات	ادراکات	۲۶۸	۱۱
الی	انی	۱۳۰	۴	مذکورد	مذکورہ	۲۶۱	۵
؍؍	؍؍	؍؍	۹	وجود	وجود	؍؍	۸
روح	روح اللہ	۱۳۵	۵				
جب کہ	جیسا کہ	۱۴۲	۱۳				
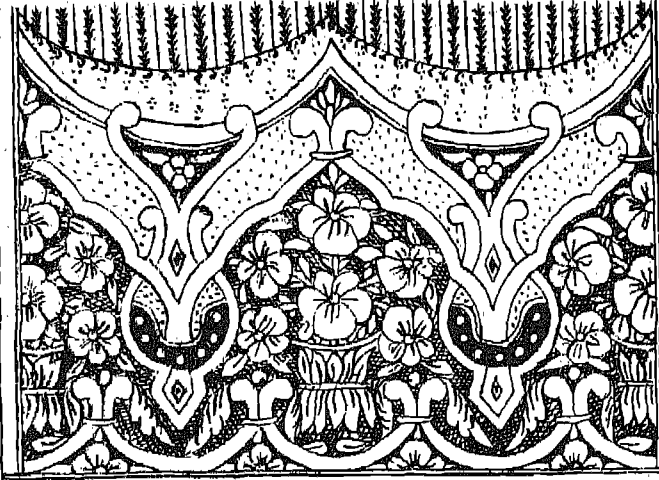
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ سورۂ ناس سے متعلق چند اشارات ومضامین ہدیۂ طلبا کئے جاتے ہیں۔ اگر غور و فکر سے اس کو دیکھیں تو غالباً اس امر کی صلاحیت پیدا ہوگی کہ تعمق نظر سے مضامین پیدا کرسکیں۔

قُلْ

علمائے صرف نے تصریح کی ہے کہ قُلْ اجوف ہے۔ اور اجوف ائے

کہتے ہیں جس کے جوف یعنی بیچ میں حرفِ علّت ہو یہاں یہ پریشانی ہوتی ہے کہ قُلْ کے کُل دو حرف ہیں۔ پہلا قاف اور دوسرا لام۔ اس میں جوف ہی نہیں تو جوف میں حرفِ علّت کیسا۔ اگر بدوؤں سے کہا جائے کہ قُلْ کے اندر تیسرا حرف بھی ہے اور وہ حرفِ علّت ہے تو باوجودیکہ وہ عرب ہیں۔ مگر بادیہ کے رہنے والے ہیں اس کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔ اور یہی کہیں گے کہ ہم اپنے آبا و اجداد سے قُلْ کے دو ہی حرف سُنتے آئے ہیں۔ یہ تیسرا حرف کہاں سے آگیا۔ اگر ان کے مقابل میں صرفی دلائل قائم کئے جائیں تو وہ سب کا ایک ہی جواب دیں گے کہ قَدْ وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی هٰذَا وَاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُقْتَدُوْنَ۔ یعنی ہم نے اپنے آبا و اجداد کو اسی پر پایا ہے اور ہم اُنہی کی پیروی کریں گے۔ پھر اگر کچھ زیادہ کہا جائے تو چونکہ بادیہ کے رہنے والے یعنی جنگلی ہیں ضرور لڑائی ہو جائے گی۔ غرضکہ وہ کبھی نہ مانیں گے کہ قُلْ کے باطن میں بھی کوئی حرف ہے۔ بات یہ ہے کہ سُنتے سُنتے اور دیکھتے دیکھتے آدمی کی نظر محسوسات پر ایسی جم جاتی ہے کہ باطن پر پڑتی ہی نہیں اگر آدمی کو موت نہ ہوتی تو کبھی خیال نہ آتا کہ جان بھی کوئی چیز ہے۔ جب آدمی دیکھتا ہے کہ باتیں کرتے کرتے یکبارگی ایسی حالت اُس پر طاری ہو گئی کہ دیکھنا۔ سُننا۔ چلنا۔ پھرنا۔ بات کرنا۔ موقوف ہو گیا اور اس قابل ہو گیا کہ زمین میں چھپا دیا جائے تو اُس وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس میں ایسی ضرور تھی جس کے نکل جانے سے یہ سب باتیں جاتی رہیں۔ اور جب تک وہ چیز اس میں

تھی یہ کارخانہ انسانیت کا قائم تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ظاہری انسانیت کا مدار ایک باطنی چیز پر تھا۔ پھر اس باطنی چیز کا نام کسی نے روح رکھا کسی نے جان وغیرہ۔ ہر قوم کے عقلا جن کی نظر آثار سے ترقی کر کے مؤثر تک پہنچی اُنہوں نے اِس باطنی چیز تک نظر بڑھا کر کچھ نہ کچھ اس کا نام رکھ ہی لیا ورنہ جو لوگ بہائم سیرت ہیں اُن کو تو اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ کسی چیز کے آنے سے آدمی زندہ اور اُس کے جانے سے مُردہ ہو جاتا ہے۔ اُن کو اس تشخیص کی مصیبت اُٹھانے سے کیا تعلق ان کو تو جانوروں کی طرح کھانا پینا مل گیا تو عید ہو گئی اور نہ ملا تو اس کی تلاش کی فکر ہے۔

غرضکہ لفظ قُلْ کو اجوف کہنا اور اُس کے اندر ایک حرفِ علّت کا ماننا سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر جو عقلا تھے اُنہوں نے دیکھا کہ قُلْ کے معنی کہہ کے ہیں جو امر کا صیغہ ہے اس میں بھی قاف اور لام ہے اور قَالَ یَقُوْلُ قَائِلٌ وغیرہ میں بھی یہی قاف و لام ہیں مگر ان کے ساتھ کوئی دوسرے حروف بھی ہیں تو ان کی عقل نے گواہی دی کہ قُلْ میں بھی کوئی حرف ضرور تھا جو کسی وجہ سے حذف ہو گیا۔ اب اُنہوں نے غور کیا کہ قَالَ میں (الف) ہے اور قِیْلَ میں (ی) اور قَوْلٌ میں (واؤ) ان میں سے کونسا حرف اس میں ہو گا پہلے اصل کو تلاش کرنے کی ضرورت ہوی۔ دیکھا کہ ماضی کے معنی کہا اور اسمِ فاعل کے معنی کہنے والا اور اسی طرح ہر صیغہ کے معنی ہیں کہنے کے معنی کے ساتھ کوئی اور زیادتی بھی ہے۔ اس سے معلوم کیا کہ کہنا جس کے معنی ہیں وہی اصل ہے یعنی قَوْلٌ

کہتے ہیں جس کے جوف یعنی بیچ میں حرفِ علّت ہو یہاں یہ پریشانی ہوتی ہے کہ
قُل کے کُل دو حرف ہیں۔ پہلا قاف اور دوسرا لام۔ اس میں جوف ہی نہیں تو
جوف میں حرفِ علّت کیسا۔ اگر بدّووں سے کہا جائے کہ قُل کے اندر تیسرا
حرف بھی ہے اور وہ حرفِ علّت ہے تو باوجودیکہ وہ عرب ہیں۔ مگر بادیہ کرنے والے
ہیں اس کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔ اور یہی کہیں گے کہ ہم اپنے آباؤاجداد سے قُل کے
دو ہی حرف سُنتے آئے ہیں۔ یہ تیسرا حرف کہاں سے آگیا۔ اگر ان کے مقابل میں
صرفی دلائل قائم کئے جائیں تو وہ سب کا ایک ہی جواب دیں گے کہ قَدْ وَجَدْنَا
اٰبَاءَنَا عَلٰی ھٰذَا وَاِنَّا عَلٰی اٰثَارِھِمْ مُقْتَدُوْنَ۔ یعنی ہم نے اپنے
آباؤاجداد کو اسی پر پایا ہے اور ہم اُنہی کی پیروی کریں گے۔ پھر اگر کچھ زیادہ کہا
جائے تو چونکہ بادیہ کے رہنے والے یعنی جنگلی ہیں ضرور لڑائی ہو جائے گی۔
غرضکہ وہ کبھی نہ مانیں گے کہ قُل کے باطن میں بھی کوئی حرف ہے۔ بات یہ ہے کہ
سُنتے سُنتے اور دیکھتے دیکھتے آدمی کی نظر محسوسات پر ایسی جم جاتی ہے کہ باطن پر
پڑتی ہی نہیں اگر آدمی کو موت نہ ہوتی تو کبھی خیال نہ آتا کہ جان بھی کوئی چیز ہے۔
جب آدمی دیکھتا ہے کہ باتیں کرتے کرتے یکبارگی ایسی حالت اُس پر طاری ہوگئی
کہ دیکھنا۔ سُننا۔ چلنا۔ پھرنا۔ بات کرنا۔ موقوف ہوگیا اور اُس قابل ہوگیا کہ
زمین میں چُھپا دیا جائے تو اُس وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس میں ایسی ضرور
تھی جس کے نکل جانے سے یہ سب باتیں جاتی رہیں۔ اور جب تک وہ چیز اس میں تھی

تھی یہ کارخانہ انسانیّت کا قائم تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ظاہری انسانیّت کا مدار ایک باطنی چیز پر تھا۔ پھر اس باطنی چیز کا نام کسی نے روح رکھا کسی نے جان وغیرہ۔ ہر قوم کے عقلا جن کی نظر آثار سے ترقی کر کے مؤثر تک پہنچی انہوں نے اس باطنی چیز تک نظر بڑھا کر کچھ نہ کچھ اس کا نام رکھ ہی لیا ورنہ جو لوگ بہائم سیرت ہیں اُن کو تو اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ کسی چیز کے آنے سے آدمی زندہ اور اُس کے جانے سے مُردہ ہو جاتا ہے۔ اُن کو اس تشخیص کی مصیبت اُٹھانے سے کیا تعلق اُن کو تو جانوروں کی طرح کھانا پینا مل گیا تو عید ہو گئی اور نہ ملا تو اس کی تلاش کی فکر ہے۔

غرضکہ لفظ قُلْ کو اجوف کہنا اور اُس کے اندر ایک حرفِ علّت کا ماننا سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر جو عقلا تھے اُنہوں نے دیکھا کہ قُلْ کے معنی کہہ کے ہیں جو امر کا صیغہ ہے اس میں بھی قاف اور لام ہے اور قَالَ یَقُوْلُ قَائِلٌ وغیرہ میں بھی یہی قاف و لام ہیں مگر ان کے ساتھ کوئی دوسرے حروف بھی ہیں تو ان کی عقل نے گواہی دی کہ قُلْ میں بھی کوئی حرف ضرور تھا جو کسی وجہ سے حذف ہو گیا۔ اب اُنہوں نے غور کیا کہ قَالَ میں (الف) ہے اور قِیْل میں (ی) اور قَوْلٌ میں (واؤ) ان میں سے کونسا حرف اس میں ہو گا پہلے اصل کو تلاش کرنے کی ضرورت ہوئی۔ دیکھا کہ ماضی کے معنی کہا اور اسم فاعل کے معنی کہنے والا اور اسی طرح ہر صیغہ کے معنی میں کہنے کے معنی کے ساتھ کوئی اور زیادتی بھی ہے۔ اس سے معلوم کیا کہ کہنا جس کے معنی ہیں وہی اصل ہے یعنی قَوْل

اسی کو مصدر اور سب کا اصل قرار دیا اس وجہ سے کہ ایک ایک اعتبار سے اس کے نام بدلتے گئے وہی قول خاص خاص وضع کے لحاظ سے ماضی۔ مضارع امر۔ نہی۔ اسم فاعل۔ اسم مفعول۔ صفت مشبہ۔ ظرف۔ اسم تفضیل وغیرہ بنتا گیا جس سے معلوم ہوا کہ مصدر ایک ایسی چیز ہے کہ سب میں دائر و سائر ہے۔ چونکہ مصدر میں واؤ تھی اس وجہ سے یقینی طور پر حکم لگا دیا کہ قَالَ میں بظاہر الف ہے مگر در اصل وہ بھی واؤ تھا۔ کسی وجہ سے وہ واؤ اس مقام خاص میں بشکل الف نمایاں ہوئی۔ اور قِيْلَ میں اگرچہ (ی) ہے مگر وہ بھی واؤ ہی تھی جو کسی وجہ سے بشکل (ی) نمایاں ہوئی۔ جاہل جہاں قَالَ میں الف اور قِيْلَ میں (ی) دیکھتا ہے۔ عالم وہاں قَوْلٌ کی واؤ خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ظاہر اکچھ بھی ہو مگر باطن میں واؤ ہے۔

دریافت اصل

ہر چیز کی اصل دریافت کرنی ایک مشکل کام ہے۔ جب تک خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ ہو کوئی اصل تک نہیں پہنچ سکتا۔ دیکھئے عالم کی اصل یعنی موجد مقرر کرنے میں کیسے کیسے عقلا حیران ہیں کوئی کہتا ہے اصل کچھ بھی نہیں یہ سب یوں ہی بخت و اتفاق سے کام چل رہا ہے کوئی کہتا ہے کہ مادہ اصل ہے جس کے انقلابات سے یہ صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ مگر جن کو خدائے تعالیٰ نے ہدایت کی وہ جانتے ہیں کہ یہ سب مخلوق ہیں جب تک کوئی مستقل وجود نہ ہو جس میں تمام صفات کمالیہ موجود ہوں۔ مثلاً علم قدرت

ارادہ وغیرہ کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔
مصدر کو آپ جانتے ہیں کہ ظرف ہے یعنی جائے صدور افعال اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصدر یعنی قول کے اندر کل مشتقات یعنی قَالَ یَقُوْلُ وغیرہ بھرے ہوئے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ قَوْلٌ ہی سے ان تمام افعال کا صدور ہوا ور باوجودیکہ قَالَ یَقُوْلُ قَائِلٌ وغیرہ کے اشکال باہم ممتاز ہیں ان سب کا صدور مصدر سے ہے جیسے کُل افعال کا صدور روح سے ہوتا ہے اگر روح نہ ہو تو چلنا ہو نہ پھرنا نہ دیکھنا نہ سننا اس سے ظاہر ہے کہ کل افعال کا مصدر روح ہے یعنی جتنے افعال کی شکلیں ہمارے اعضائے ظاہری سے دیکھی جاتی ہیں مثلاً چلنے کے وقت ہمارے جسم میں ایک ایسی ہیئت پیدا ہوتی ہے جو بیٹھنے کے وقت نہیں ہوتی۔ ان سب کا مصدر وہی روح ہے پھر روح بھی آخر ایک مخلوق چیز ہے جب تک اس کا مصدر نہ ہو عالم شہادت میں اس کا ظہور ممکن نہیں۔ کیونکہ بغیر مصدر کے کسی چیز کا صدور وظہور نہیں ہوسکتا۔
غرضکہ جس طرح عقلاء لفظ قُلْ سے اس کے مصدر تک پہنچ گئے اسی طرح مخلوقات کو دیکھکر خالق تک پہنچ گئے اور جس طرح قُلْ کے باطنی واو کو یقینی طور پر مان لیا یہاں تک کہ اگر اس کے وجود پر قسم کھانے کو کہا جائے تو تعجب نہیں کہ عالم قسم کھا کر کہے کہ بیشک حرف علت یعنی واو قُلْ میں ضرور ہے اور قُلْ مُعْتَل ہے۔ اسی طرح عقلمند قسم کھا کر کہیگا کہ خدائے تعالےٰ جسکو علت العلل بھی

ایک اعتبار سے کہہ سکتے ہیں موجود ہے گو نظروں سے غائب ہے۔
اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ قَوْلٌ سے قُلْ کس طرح بنا سو پہلے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ زمانہ ماضی بہ نسبت حال و استقبال کے مقدم ہے اور مصدر بھی تمام مشتقات پر مقدم ہے۔ اس مناسبت سے ضرور تھا کہ فعل ماضی مصدر سے صادر اول ہو۔ ہر چند مصدر میں کوئی زمانہ نہیں بلکہ اُس کو جو نسبت ماضی کے ساتھ ہے وہی حال و استقبال کے ساتھ بھی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تقدم کی وجہ سے ماضی کو جو اس کے ساتھ نسبت ہے وہ مضارع کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خاص نسبت خالق عزّ و جلّ کے ساتھ ہے دوسرے کو نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ آپ صادر اول ہیں جو اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے۔ اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ وَکُلُّ شَیْءٍ مِنْ نُوْرِیْ۔
الحاصل مصدر سے پہلا صادر فعل ماضی ہے جس میں کچھ زیادتی ہو کر مضارع بنا۔ غرضکہ قَالَ سے مضارع یَقُوْلُ بنا اور مضارع سے قُلْ امر۔ اس لئے کہ امر میں بھی وہی زمانہ حال اور استقبال ہے۔ شاید تدقیق نظر سے یہاں پر یہ خیال کیا جائیگا کہ جس زمانے میں حکم کیا جاتا ہے اُس وقت فعل وجود میں نہیں آ سکتا بلکہ اُس کے بعد مخاطب اُس کام کو وجود میں لاتا ہے۔ اس لئے امر میں زمانہ حال نہیں ہو سکتا سو اس کو یوں دفع کرنا چاہیئے کہ یہ خارجی سبب ہے کیونکہ جب تک امر کا صیغہ ختم نہ ہولے مخاطب امتثال نہیں کر سکتا۔ مگر اس کو وضع میں

حدیث: اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ

کوئی دخل نہیں۔ بسا وقت متکلّم کو یہ منظور ہوتا ہے کہ فوراً وہ کام کیا جائے اس
لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قصدِ متکلّم کے لحاظ سے وہ زمانۂ حال ہی سمجھا جائے گا
گویا متکلّم اُس کو یہ کہہ رہا ہے کہ یہ کام ابھی کر۔ غرضکہ مضارع اور امر میں مناسبت
ہونے کی وجہ سے امر مضارع سے بنایا گیا۔ اس طور پر کہ پہلے علامتِ مضارع
حذف کی گئی کیونکہ اب وہ امر بننے والا ہے۔ اگر پہلے لوازم وخصوصیات باقی
رہیں تو کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ اسی وجہ سے اگر کوئی شخص کمال حاصل کرنا چاہتا ہے
تو اُس کو ضرور ہوگا کہ اپنی حالتِ سابقہ کے لوازم وآثار کو دور کردے مثلاً
طالبِ علم اگر عالم بننا چاہے تو جتنے لوازم وآثار جہالت کے ہیں۔ جیسے
تضیعِ اوقات سُستی۔ کاہلی۔ خود پسندی وغیرہ جب تک ترک نہ کردے عالم
نہیں بن سکتا۔ جس طرح تَقُوْلُ کا (تَ) جو لوازم مضارع سے ہے۔ جب تک
دور نہ کیا جائے وہ امر نہیں بن سکتا۔ اسی پر ہر قسم کے ترقیات کو قیاس کر لیجئے
مثلاً جب تک لوازم ورسوم بشریّت فنا نہ ہوں مَلَکیّت میں گذر ممکن نہیں۔

اَلغرض تَقُوْلُ کا (تَ) امر بنانے کے لئے حذف کیا گیا ہے۔ اب رہگیا
قُوْلُ مگر یہ خیال نہ کیا جائے کہ اب وہ مصدر بن گیا اس لئے کہ فرع اپنی
اصل نہیں بن سکتی اور قطع نظر اُس کے اس قُوْل کا تو پڑھنا ہی ممکن نہیں۔ کیونکہ
ابتدا بالسکون محال ہے۔ اس پر کھلی دلیل یہ ہے کہ جب تک ہم عدم میں تھے ساکن
تھے کسی قسم کی حرکت ہم میں نہ تھی۔ پھر جب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ہم وجود میں آئیں

تو کنؔ کا ارشاد ہوا جس سے ہم میں ابتداً کسی قسم کی حرکت پیدا ہوئی پھر پیاپے حرکات شروع ہو گئے کہ آج علقہ بنا کل مضغہ وغیرہ یہاں تک کہ پورے انسان بن گئے اگر وہ ابتدائی حرکت نہ ہوتی اور سکون ہی سکون ہوتا تو ہم اس درجہ تک کبھی نہ پہنچ سکتے۔

الغرض ابتدا بسکون ہونے کی وجہ سے صیغۂ امر کا وجود ممکن نہ تھا اس لئے کہ اس کے پہلے ایک متحرک حرف لانے کی ضرورت ہوئی اور وہ حرف ایسا تجویز کیا گیا کہ عالم حروف یعنی منہ میں سب سے پہلے اس کا وجود ہو جو حلق کے انتہائی حصے سے نکلتا ہے۔ جس طرح ابتدا بسکون محال ہونے کی وجہ سے ممکن نہ تھا کہ قُول ظہور میں آئے۔ اسی طرح عالم جو سکون عدم میں تھا بوجہ سکون ممکن نہ تھا کہ موجود ہو سکے۔ اس لئے پہلے اسی عالم میں سے ایک مقدس ذات کو متحرک فرمایا یعنی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک کو جس کو تمام عالم پر ایسا تقدم ہے جیسے ہمزہ کو عالم حروف پر اگر ہمزہ قُول کے پہلے نہ لایا جاتا تو قُول کا عالم حروف میں ظہور محال تھا اسی طرح اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک متحرک نہ ہوتا تو عالم کا ظہور محال تھا جیسا کہ حدیث شریف لولاکَ لما خلقتُ الافلاکَ میں ظاہر ہے۔ اور جس طرح ہمزہ کی کوئی شکل نہیں جیسا کہ کتب صرف میں مصرح ہے کہ کبھی بشکل واؤ لکھا جاتا ہے اور کبھی بشکل یا وغیرہ اسی طرح اس مقدس نور کی کوئی شکل نہیں جیسا کہ اس حدیث شریف سے

مستفاد ہے اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ وَکُلُّ شَیْءٍ مِنْ نُوْرِیْ - غرضکہ اس متحرک ہمزہ نے گویا صیغۂ امر کو وجود بخشا جس طرح اُس مقدّس نور نے عالم امکان کو - بہر حال اب وہ لفظ اُقْوُلُ بنا - مگر چونکہ واؤ خود دو ضمّوں سے بنتی ہے اس لئے ضمّہ اس پر ثقیل تھا ماقبل کو نقل کر کے دیا گیا اب وہ اُقُوْلُ ہوا - چونکہ متکلّم کو حکم کرنے کے وقت یہ جلدی ہوتی ہے کہ مخاطب اس کام کو جلد بجا لائے اس جلدی کا یہ اثر ہے کہ وہ اتنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ صیغۂ امر کے آخر میں حرکت باقی رہے کیونکہ حرکات زیر - زبر - پیش ہیں اور یہ بھی چھوٹے حروف ہیں اس لئے کہ دو زبر کا الف اور دو پیش کی واؤ اور دو زیر کی یا ہوتی ہے - متکلّم کا مقصود اس وقت یہی ہوتا ہے کہ جہانتک ہو سکے کلمہ مختصر ہو جائے - اور آپ ساکت اور ساکن ہو کر مخاطب کو متحرّک کر دے - اس لئے آخر کلمہ کی حرکت کو اور جو حروف کہ حرکت کے امتداد سے پیدا ہوتے ہیں یعنی الف اور واؤ اور یا کو دور کر کے کلام کو جلد ختم کر دیتا ہے - جب وضع امر سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ امر کے وقت متکلّم کا یہ مقصود ہوتا ہے کہ امتثال امر میں دیر نہ ہو - تو جو عُقلاء ہیں امتثال امر میں بہت جلد مصروف ہو جاتے ہیں - خصوصاً اُن لوگوں کے امتثال امر میں جن کے حکم کو قابل امتثال سمجھتے ہیں - اسی وجہ سے عملہ میں جو لوگ عقلمند ہوتے ہیں وہ اپنے حاکم بالادست کا امر ہوتے ہی فوراً اُس کی تعمیل کرتے ہیں اور حکّام کی نظروں میں بھی ایسے ہی لوگ باوقعت اور قابل ترقّی ہوتے ہیں -

جب حکام مجازی کے احکام بجالانے کا یہ حال ہو تو آحْکَمُ الْحَاکِمِیْن کے حکموں کی تعمیل میں کس قدر جلدی کرنی چاہیئے۔ اور جو لوگ اُن احکام کو عمدگی اور سرگرمی سے بجالاتے ہیں اُن کے مدارج کی ترقی کس درجہ ہوتی ہو گی۔

الحاصل اس ضرورت سے امر کے آخر میں سکون آگیا اب اُقْوُلْ بنا۔ دو ساکن ایک جگہہ جمع ہوئے۔ ایک ساکن حذف کیا گیا کیونکہ دو ساکنوں کے ملنے سے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک ساکن ہو اور دوسرا متحرک ہو تو متحرک کے طفیل میں ساکن بھی کچھ کرلے گا جس طرح نابینا دیکھنے والے کے طفیل میں منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے اور اگر دونوں اندھے اور راستہ سے ناواقف ہوں تو کبھی نہیں پہنچ سکتے

آپ جانتے ہیں کہ عدم میں جتنی چیزیں ہیں خواہ وہ ذوات ہوں یا افعال ان کو کسی قسم کی حرکت نہیں۔ سب کے سب عدم آباد میں ساکن ہیں جو خدائے تعالیٰ کے پیش نظر ہیں جب تک اُن کو قادرِ مطلق کُنْ کہکر حرکت نہ دے کبھی حرکت اُن کو نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ حق تعالےٰ جو خالق عالم ہے اُس نے خبر دی ہے کہ جب کسی چیز کو ہم پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اُس کو کُنْ کہدیتے ہیں اور وہ وجود میں آجاتی ہے کما قال تعالیٰ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنَاهُ اَنْ نَقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ اس سے ظاہر ہے کہ عدم سے وجود میں لانے کی تحریک قدرت سے ہوتی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ بندے کی قدرت خود بالذات موجود نہیں اس لئے کہ خود بندہ ہر حال میں خالق کا محتاج ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَى اللهِ تو اُس کی

حرکت بغیر تحریک خالق کے کیونکر ہو سکے۔ غرضکہ بندے کی قدرت بھی ساکن ہے اور معدومات بھی ساکن اس لئے عقلاء ایک ساکن کو یعنی بندے کی قدرت کو حذف کر دیتے ہیں کیونکہ التقائے ساکنین سے کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی اور بندے کو صرف کاسب اور خدائے تعالیٰ کو خالق افعال سمجھتے ہیں۔ غرضکہ التقائے ساکنین سے واو گر گئی اور اقُل ہوا چونکہ قاف متحرک ہو چکا تھا اس لئے اب ہمزہ کی ضرورت نہ رہی اور وہ بھی حذف کر دیا گیا اور قُل باقی رہ گیا۔

اگرچہ یہ تقریر بظاہر دل لگی سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ صرفی مباحث میں الٰہیات و اخلاقی مسائل کی جوڑ لگا دی گئی۔ مگر اہل بصیرت جانتے ہیں کہ ہمارے دین میں ایسے امور کی تعلیم دی گئی ہے چنانچہ اس آیۂ شریفہ سے مستفاد ہے فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِي الْاَبْصَارِ دیکھئے کل عقلمندوں اور اہل بصیرت کو عبرت حاصل کرنے کا حکم ہو رہا ہے۔

جن کی نظر اصولِ لغت پر ہے وہ جانتے ہیں کہ جس لفظ میں (ع ب ر) ہو اس میں عبور اور تجاوز کے معنی ضرور ہوں گے۔ دیکھئے معبرہ گذر کو کہتے ہیں جہاں آدمی ٹھیر نہیں سکتا اور عبور کے معنی اُس پار اتر جانے کے ہیں۔ اسی طرح عرب کا نام بھی عرب اس وجہ سے رکھا گیا کہ وہ ایک جگہ مقیم نہیں رہتے تھے اسی طرح کل تقالیب میں تجاوز کے معنی ہیں۔ اب اعتبار کی حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا چیز ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن شریف میں قارون۔ فرعون۔ ہامان۔ شداد۔ نمرود۔ بنی اسرائیل وغیرہ اشخاص و اقوام کے

بہت سے قصّے مذکور ہیں اور یہ بھی ہر عاقل جانتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی شان نہیں کہ
گذشتہ لوگوں کے قصّے کہانیاں بیان کرے بلکہ کلام الٰہی کی شان یہ ہے کہ
جو بات ہو اس میں بندوں کی ہدایت اور بہبودی دارین رکھی ہو۔ اس سے
یہ ماننا پڑے گا کہ جتنے قصّے قرآن شریف میں مذکور ہیں سب سے مقصود یہی ہے
کہ اس قسم کے کام اگر ہم بھی کریں تو ہمارا انجام وہی ہوگا جو اُن کا ہوا ہے اس سمجھ
کا نام عبرت ہے۔ پس اس سے یہی ثابت ہوا کہ جو واقعہ سنا جائے اُس سے
عُبور کرکے دوسری طرف نظر ڈالی جائے اور ایک نیا مضمون پیدا کیا جائے
مثلاً قارون کے قصّے سے یہ عبرت ہونی چاہیئے کہ جو شخص مال کے ساتھ اتنی
محبّت رکھے اور دین کے کاموں میں اُس کو صرف نہ کرے تو اُس کا انجام ہلاکت
اور عذاب ہے۔ غالباً ایسے لوگ بھی ہونگے کہ تمام قرآن کے قصّے پڑھتے اور
بار بار واعظوں سے سُنتے اور کتابوں میں دیکھتے ہونگے مگر حاتم طائی وغیرہ کے
فرضی قصّوں سے زیادہ دلچسپی اس میں اُن کو نہیں ہوتی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ
قرآن کے قصّے اور فرضی قصّے صرف دلچسپی کے لحاظ سے سُنے جاتے
ہیں اگر قارون کا قصّہ مثلاً عبرت کی نظر سے سنا جائے تو ممکن نہیں کہ اہل ایمان کو
مال کے ساتھ ایسا تعلق رہے کہ دینی امور میں نہ صرف کریں۔ اسی طرح فرعون
وغیرہ کے قصّوں سے اگر عبرت حاصل کی جائے تو آدمی متّقی ہو جائے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

آنچہ در فرعون بود آں در تو ہست	لیک اژدرہات محبوسِ تو ہست
اے دریغ آں جملہ احوالِ تو ہست	تو براں فرعون برخواہیش بست
آنچہ گفتم جملگی احوالِ تست	خود نہ گفتم صد یکے زانہا درست
گر ز تو گویند وحشت زایدت	ور ز دیگر آں فسانہ آیدت

حاصل یہ کہ صفاتِ فرعون وغیرہ آدمی میں موجود ہیں آدمی کو چاہئیے کہ ان سے پرہیز کرے ورنہ انہیں سزاؤں کا مستحق ہوگا جو ان لوگوں کو دی گئی تھیں۔ ایک بزرگ راستے سے جارہے تھے سُنا کہ ککڑی بیچنے والا کہہ رہا ہے اَلْخِیَارُ بِعَشْرَۃٍ یعنی ککڑی ایک پیسہ کو یہ سنتے ہی اُنکی حالت متغیر ہوئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ بیہوش ہوکر گر پڑے دیر کے بعد جب ہوش آیا اور لوگوں کو دیکھا کہ بیہوشی کی وجہ تلاش کر رہے ہیں فرمایا کہ جب اُس شخص سے میں نے سُنا کہ بآوازِ بلند بہ سرِ بازار کہہ رہا ہے کہ خیار ایک پیسہ کو تو میرے خیال میں یہ بات جمی کہ خیار یعنی اچھے لوگوں کی جب یہ حالت ہو تو شرار کو کون پوچھے اپنی اعمال کا نقشہ میرے پیشِ نظر ہوگیا جس سے میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور بے ہوشی طاری ہوگئی۔
دیکھئے اَلْخِیَارُ بِعَشْرَۃٍ سے وہ حضرت عبور کرکے کہاں پہنچ گئے۔ حالانکہ دونوں میں سوائے لفظی مناسبت کے کوئی معنوی مناسبت نہیں۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

نہ گویند از سرِ بازیچہ حرفے
کزاں پندے نہ گیرد صاحب ہوش

لطائفِ اشرفی میں لکھا ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے ایک روز ناقوس کی آواز سُنی لوگوں سے پوچھا کیا جانتے ہو کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ لوگوں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا یہ کہتا ہے سُبْحَانَ اللّٰہِ حَقًّا حَقًّا اِنَّ الْمَوْلٰی یَبْقٰی۔

یہ بات تو معلوم ہوئی کہ قَوْل مصدر ہے اسی سے تمام صیغے بنتے ہیں۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ مصدر کے ساتھ ایک خاص نسبت متعلق ہو جاتی ہے جس سے خاص معنی پیدا ہوتے ہیں جو نام کے بدلنے کے باعث ہوتے ہیں مثلاً قَوْل کے معنی (کہنا) ہیں اس کے ساتھ یہ نسبت لگی کہ کہنا زمانہ گذشتہ میں واقع ہوا۔ اس کا نام ماضی ہوا اور اُس کے لئے صورت بھی ایک خاص قسم کی پیدا ہوئی یعنی قَالَ۔ غرضکہ قَالَ وہی قَوْل ہے جس کے ساتھ نسبت مذکورہ ہے اور اُسی قَوْل میں جب یہ نسبت ملحوظ ہوئی کہ حال و استقبال میں اس کا وقوع ہے تو اُس کا نام مضارع ہوا اور صورت یَقُوْلُ بنی جس کا مطلب یہ ہوا کہ یَقُوْلُ صرف قَوْل ہے مگر نسبت مذکورہ کے لحاظ سے۔ علیٰ ہذا القیاس قَائِلٌ میں بھی وہی قَوْل ہے جس کے ساتھ یہ نسبت ملحوظ ہے کہ قَوْل کو کسی شخص کے ساتھ خاص قسم کی نسبت ہے کہ قَوْل اس میں پایا جا رہا ہے جس سے معنی مَنْ لَہُ الْقَوْلُ کے صادق آتے ہیں۔ بہر حال جتنے مشتقات ہیں سب میں وہی قَوْل دائر اور سائر ہے۔ گو صورتیں جُدی جُدی ہیں۔ اب اگر کہئے کہ قَوْل کا ظہور قَالَ یَقُوْلُ وغیرہ میں ہوا اور وہ مصدر کے مظاہر ہیں تو بے موقع

نہ ہوگا کیونکہ آخر مصدر رہی ہیں وہ تمام نسبتیں ملحوظ ہیں جو یہ تمام صورتیں پیدا کرہی ہیں اب اگر ان نسبتوں کو دیکھئے تو نہ قوؔل کی ذات میں داخل ہیں نہ مشتقات کی ذاتوں میں کیونکہ نسبت غیر مستقل چیز ہے جو نسبتین کے درمیان ہوتی ہے حالانکہ مشتقات مستقل صیغے ہیں۔ مگر ہوا یہ کہ نسبت غیر مستقلہ نے ان کی مستقل صورتیں بنادی اسی قسم کی تقریر کلیات میں بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً حیوان فی حد ذاتہ ایک ہے اس میں کسی قسم کی کثرت نہیں۔ کیونکہ معنی سے صاف ظاہر ہے کہ جب اس کا اطلاق ہوگا ایک ہی شخص پر ہوگا اگر دو پر اطلاق ہو تو حیوانان اور کثیر پر ہو تو حیوانات کہیں گے۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ حیوان کے ساتھ جو فصول لگتے ہیں وہ اس کے اوصاف ہیں یا کوئی مستقل چیزیں ہیں۔ یہ ہرگز سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مستقل چیزیں ہیں بلکہ ظاہر ہے کہ نطق مثلاً ایک صفت ہے جس طرح علم وغیرہ اسی طرح ہندی رومی وغیرہ بھی صفات ہیں۔ غرضکہ کوئی صفت داخلِ نفسِ شئے نہیں ہوسکتی۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ نطق و سمع و علم وغیرہ صفات ہیں تو کیا وجہ کہ نطق تو انسان کی ذات میں داخل ہو اور علم وغیرہ اس سے خارج رہیں۔

بہرحال حیوان ایک چیز ہے اس کے ساتھ کبھی نطق کا لحاظ ہوتا ہے۔ کبھی دوسرے صفات کا اور جس صفت کا لحاظ ہوگا ایک نام اس پر آجائے گا۔ مثلاً نطق کا لحاظ ہوگا تو اس کو آدمی کہیں گے۔ اور اس صفت کا مدار ایک نسبت پر ہوگا۔ مثلاً علم ایک خاص نسبت ہے جو عالم و معلوم کے درمیان ہے جس کی

وجہ سے ایک کو عالم اور دوسرے کو معلوم کہتے ہیں۔ اسی طرح حیوان اور نُطق
میں ایک خاص نسبت ہے جس کی وجہ سے اُس کو ناطق کہتے ہیں۔ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے سے جانور۔ لکڑی۔ پتھر بات کرتے تھے، یہی
نسبت اُن میں پائی گئی اس لئے اُن پر بھی ناطق کا اطلاق ہوا اس سے یہ
بھی معلوم ہوا کہ گو نُطق صفت ہے مگر اُسی وقت تک کہ آدمی بات کرتا ہے
اور جب بات کرنا موقوف کر کے کسی کی بات سُننے لگا تو اُس کو سامع کہیں گے
علیٰ ہذا القیاس دوسرے صفات۔ اب وقت واحد میں صرف اس لحاظ سے کہ
کسی وقت اس نے بات کی تھی یا سُنی تھی اُس کو ناطق اور سامع کہنا مجازاً ہوگا
حقیقۃً ناطق اُسی وقت سمجھا جائے گا کہ جب بات کر رہا ہو۔ کلام اس میں تھا کہ
قول واحد شخصی ہے جو قَالَ یَقُوْلُ قَائِلٌ وغیرہ میں ظہور کر رہا ہے
مگر یہاں یہ خیال نہ کیا جائے کہ جس طرح پانی کوزے وغیرہ میں ہوتا ہے
اُسی طرح قول ماضی وغیرہ میں ہے۔ اس لئے کہ کوزہ مستقل چیز ہے
اور پانی بھی مستقل ہے۔ ایسی صورت کو حُلول کہتے ہیں۔ اور یہاں یہ بات
نہیں ہے۔ اس لئے کہ قول کی ان صورتوں میں فقط ہیئت بدل رہی ہے،
جیسا کہ ضِحک کی وجہ سے انسان کی ہیئت بدل جاتی ہے جس کی وجہ سے
اس کو ضاحک کہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ انسان ضاحک میں حُلول کر گیا ہے
جب یہ معلوم ہوا کہ قول بذاتہٖ موجود اور بلا تغیر و تبدل سب میں دائر و سائر ہے

کیونکہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قول کا ظہور جب تک قال میں ہے یقول میں نہیں بلکہ یقیناً کہا جاتا ہے کہ ہر وقت پورے قول کا ظہور قال یقول وغیرہ کل مشتقات میں یکساں ہے تو اس موقع میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ الکل فی الکل یعنی کل قول سب مشتقات میں ہے۔ البتہ ہر ایک مظہر کی خصوصیت جدا گانہ ہے مثلاً قائل کہ سب زمانوں سے آزاد ہے۔ مگر ایسی ذات کا محتاج ہے جس میں قول پایا جائے اور قال یقول زمانوں کے ساتھ مقید ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس کل مشتقات کسی نہ کسی چیز کے محتاج ہیں اور قول باوجود ان سب میں دائر و سائر ہونے کے کل احتیاجوں سے بری ہے اور باوجودیکہ کل مشتقات میں نازل ہے مگر کسی کا محتاج نہیں۔ بخلاف ان مشتقات کے کہ وہ ہر وقت اس کے محتاج ہیں کیونکہ جب تک قول کا وجود اُن میں نہ ہو کسی کا وجود نہیں ہو سکتا۔

اَعُوذُ

(اَعُوذُ) یعنی پناہ مانگتا ہوں میں۔ پناہ جو کسی سے چاہی جاتی ہے اُس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی چیز مضر اس کے پیش نظر ہو جاتی ہے جس کی مقاومت نہیں کر سکتا اور اپنے میں یہ قوت نہیں پاتا کہ اُس کا مقابلہ کر سکے اس لئے کسی ایسے شخص کو تلاش کرتا ہے جو اُس کا مقابلہ کر کے اُس کے شر اور آفت سے بچا سکے جس چیز سے خوف ہوتا ہے۔ اُس کو

(مُعوّذ منہ) کہتے ہیں۔ اور بچانے والے کو (مُعوّذ بہ) اس آیۂ شریفہ میں (مُعوّذ منہ) شیطان کا شر ہے۔ اور مُعوّذ بہ خدائے تعالےٰ۔

خدائے تعالیٰ نے اس سورہ میں تعلیم دی کہ شیطان کے شر سے ہمارے پاس پناہ لو۔ کیونکہ ہم پرورش کرنے والے بھی ہیں اور بادشاہ بھی ہیں اور معبود بھی ان صفات کے بیان فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی وسوسہ اندازی کے مواقع یہی اوصاف ہیں۔

پہلے ربوبیت الٰہی سے متعلق وسوسے ڈالتا ہے اور حتی الامکان یہ کوشش کرتا ہے کہ خدائے تعالےٰ کی ربوبیت ذہن نشین نہ ہونے پائے کیونکہ آدمی بلکہ جانور کی بھی طبیعت کا یہ مقتضا ہے کہ اپنی پرورش کرنے والے کے ساتھ دل سے محبت رکھتا ہے اور اُس کی ربوبیت کو مانتا ہے اور اُس کی کسی بات کو نہیں ٹالتا۔ دیکھ لیجئے جو لوگ دس بارہ روپیہ ماہوار پاتے ہیں وہ اپنی سردار کی بات پر جان تک دیدیتے ہیں۔ شیطان کو بڑی فکر اس امر کی رہتی ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدائے تعالےٰ اصلی رب اور پرورش کرنے والا ہے تو اُس سے کمال درجہ کی محبت ہو جائیگی اور جو کچھ اس کے ارشادات ہیں سب مان لئے جائیں گے۔

خصوصاً پنجوقتہ نماز اور روزے اور حج و زکوٰۃ وغیرہ ضروریات دین کے لوگ پابند ہو جائیں گے۔ اور جتنی بُری باتیں ہیں سب چھوڑ دیں گے

جس سے فضل الٰہی کے مستحق ہو جائیں گے اور اس کا مقصود جو اولاد آدم علیہ السلام کو تباہ کرنا ہے فوت ہو جائے گا۔ اس لئے عموماً مسلمانوں کے خیال کو بھی حق تعالےٰ کی طرف رجوع ہونے نہیں دیتا۔ بلکہ جب کوئی حاجت اور ضرورت پیش ہوتی ہے اس وقت یہ سمجھاتا ہے کہ فلاں کے پاس چلو اور فلاں سے مدد لو اور فلاں قسم کا کام کرو۔ غرضکہ ایک ایسا سلسلہ قائم کر دیتا ہے کہ نوبت ہی نہیں آتی کہ خدائے تعالیٰ کی ربوبیت پیش نظر ہو۔ پھر اگر حاجت روائی ہوگئی تو ان کو اسباب کامیابی قرار دیتا ہے اور یہ سلسلہ اس کے خیال کو کچھ ایسا پابند بناتا ہے کہ گویا پابہ زنجیر ہو کر اسی قید خانہ میں وہ پڑا رہتا ہے اور اگر ربوبیت الٰہی کا کبھی خیال آ بھی گیا تو وہ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ بے ضرورت بہت سارے خیال ہمیشہ آتے رہتے ہیں۔ اور ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی ہدایت کے لئے ارشاد ہوا کہ جب لوگوں کی ربوبیت تمہارے پیش نظر ہو جائے اور شیطان کا افسوں تم پر اثر کر جائے تو رَبِّ النَّاس کی پناہ میں آجاؤ اور یہ سمجھ لو کہ اصل ربوبیت مفیدہ خدائے تعالیٰ ہی کی ربوبیت ہے۔ جب ربوبیت مطلقہ کے میدان میں قدم بڑھاؤ گے تو تمہیں شیطان کے شر سے جس نے تمہیں قیدی بنا رکھا ہے پناہ مل جائیگی مگر مشکل یہ ہے کہ پناہ لینے کی ضرورت ہی ہر شخص کو محسوس نہیں ہوتی۔

کیونکہ لڑکپن سے عادت ہوگئی ہے کہ اسباب ہی پر آدمی کی نظر پڑتی ہے

ضرورت تو اُن لوگوں کو محسوس ہوتی ہے جو خدائے تعالےٰ کے کلام پر صدقِ دل سے ایمان لاتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ شیطان ہمارا جانی دشمن ہے۔ اس کی عداوت کا حال خدائے تعالیٰ نے اپنے سچے کلام میں جابجا بیان فرمادیا کہیں ارشاد ہے اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ یعنی یقیناً شیطان تمہارے لئے کھلا دشمن ہے۔

اور کہیں ارشاد ہے کہ شیطان آدمی کو کافر بنا کر کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں اور خدا سے ڈرتا ہوں کما قال تعالےٰ كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ الحاصل جب آدمی خدا ورسول کے ارشادوں سے لاپروائی کرکے جس طرح عمل کرنے کا حق ہے نہ کرے اور اپنی خواہش کے مطابق باغوائے شیطانی کام کیا کرے تو شیطان کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور گناہ کراتے کراتے کفر تک نوبت پہنچادیتا ہے۔ کیونکہ خواہشات نفسانی کے مقابلہ میں کلامِ الٰہی کی وقعت ہی نہ ہو تو پھر کون سی چیز ہو گی جو کفر سے اس کو بچاسکے ممکن ہے کہ مثل اور خواہشوں کے اس کا بھی مرتکب ہوجائے۔ بخلاف اس کے ہر بات میں جب خدا ورسول کے کلام پر عمل کرنے کا خیال ہو تو کفر سے بہت کچھ احتیاط کرسکتا ہے۔ اور اگر معاذ اللہ شیطان کو کافر بنانے کا موقع مل گیا تو اُس نے بازی جیت لی اور بارگاہ الٰہی سے مطرود

دشمنی شیطان

ومردود کر کے ابدالآباد کے لئے اُس کو دوزخ کا مستحق بنادیا حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ شیطان آدمی سے کبھی بے فکر نہیں ہوسکتا جب تک اُس کو کافر نہ بنالے۔ اب غور کیجئے کہ شیطان آدمی کا کیسا دشمن ہے۔ اور کس طرح تاک میں لگا ہوا ہے۔ ایسے دشمن سے بچنے کی کس قدر ضرورت ہے جب ہمیں معلوم ہے کہ اس کا تسلط دل پر ہے جس طرح چاہتا ہے بُرے خیالات دل میں پیدا کرتا ہے۔ اگر دور ہی سے کچھ کہہ دیتا تو ممکن تھا کہ اُس کی بات کی طرف توجہ نہ کرتے مگر وہ تو ہمارے دل تک گھس جاتا ہے اور وہاں جاکر ایسی باتیں ہمارے دل میں ڈالتا ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اُس نے کہا یا ہمارے دل نے غرض کہ اُس سے بچنا ہمارے اختیار سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے جب تک ہم خدائے تعالےٰ کی پناہ میں نہ ہوجائیں۔ ممکن نہیں کہ اُس کے دام سے ہمیں رہائی ہو اسی وجہ سے تعلیم فرمائی گئی کہ شیطان کے مکروں سے اگر بچنا ہو تو ہماری پناہ میں آجاؤ۔ پھر جو شخص خدا کی پناہ میں آجائے تو ممکن نہیں کہ شیطان تو کیا تمام عالم اُس کو ضرر پہنچا سکے۔ مگر یہ یاد رہے کہ پناہ میں آجانا بھی آسان نہیں۔ صرف کہہ دینا اس کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ دیکھئے آدمی کسی کی پناہ میں اُسی وقت آتا ہے کہ جب اُس کو یقین ہو کہ موذی ضرر رسان کے مقابلہ کی طاقت اپنے میں نہیں ہے۔ پھر جس کی پناہ میں وہ جاتا ہے اُس کی نسبت یقین ہوتا ہے کہ وہ اُس کے ضرر سے ضرور بچائے گا۔ اور اُس کے

ساتھ یہ بھی ہوتا ہے جس کی پناہ میں جاتا ہے اُس کو لازم پکڑتا ہے اور اُس سے علٰحدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس سے علٰحدہ ہو جاؤں گا تو ضرور دشمن غالب ہو جائیگا۔ یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے خود (عوذ) کے لفظ سے نکلتی ہے کیونکہ (عوذ) کے معنی میں چمٹنا داخل ہے۔ جیسا کہ اس حدیث شریف سے ظاہر ہے اطیب اللحم عوذہ۔ یعنی عمدہ گوشت وہ ہی جو ہڈی کو لگا ہوا ہو چونکہ (عوذ) اور تعوّذ کا مادہ ایک ہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ تعوّذ میں بھی معنی چمٹنے اور لازم پکڑنے کے ہوں گے۔ امام منذری رح نے ترغیب و ترہیب میں ابن ماجہ سے نقل کی کہ تمیم داری رضؓ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک اونٹ دوڑتا ہوا آکر حضرت کے پاس کھڑا ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا اے اونٹ بے فکر رہ۔ اگر تو سچا ہے تو تیرا صدق تیرے کام آئے گا۔ اور جھوٹا ہے تو اس کا وبال تجھ پر ہے۔ اور فرمایا مع ان اللہ قد امن عائذنا ولیس بخائب لائذنا۔ یعنی اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جو ہم سے پناہ لیتا ہی اللہ تعالےٰ اُسے امن دیتا ہے۔ اور ہم کو پشت و پناہ بنانے والا بے نصیب نہیں ہوتا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ اونٹ کیا کہتا ہے فرمایا۔ اس کے مالک اُس کو ذبح کر کے اُس کا گوشت کھانا چاہتے ہیں اس واسطے اس نے بھاگ کر تمہارے نبی سے پناہ لی۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ لوگ دوڑتے ہوئے

اونٹ کا آنحضرت کی پناہ میں آنا

آپ پہنچے۔ جب اونٹ نے اُنہیں دیکھا حضرت کے سرِ مبارک کے قریب ہوکر
پناہ میں آگیا۔ اور اُن لوگوں نے کہا یارسول اللہ یہ ہمارا اونٹ ہی تین روز سے
بھاگا ہوا ہے۔ جو اس وقت آپ کے روبرو ملا حضرت نے فرمایا وہ تمہاری شکایت
کرتا ہے۔ اُنہوں نے کہا یارسول اللہ کیا شکایت ہے۔ فرمایا یہ کہتا ہے کہ کئی سال
تمہارے امن میں وہ پرورش پایا۔ موسم گرما میں تم اُس پر سامان لادکر اُن
مواقع میں جاتے تھے جہاں گھانس ہوتی ہے۔ اور موسم سرما میں گرم مقامات میں
جاتے تھے۔ جب وہ بڑھاپے کے قریب پہنچا تو تم نے اس سے اولادلی۔ اور بہت
سے اونٹ تمہارے پاس ہوگئے۔ اور جب تروتازہ اور سرسبز سال آیا تو تم نے
قصد کیا کہ اُس کو ذبح کرکے اُس کا گوشت کھالیں۔ اُنہوں نے عرض کی کہ یہ سب
درست ہے یارسول اللہ صلعم۔ حضرت نے فرمایا یہ مملوک صالح کی جزا نہیں ہوسکتی۔
اُنہوں نے عرض کی۔ اب ہم اس کو نہ بیچیں گے نہ ذبح کرینگے۔ حضرت نے
فرمایا تم جھوٹ کہتے ہو۔ اُس نے تم سے فریاد کی۔ اور تم نے اُس کی فریادرسی
نہیں کی۔ مجھے اُس پر رحم کرنے کا استحقاق تم سے زیادہ ہے۔ خدائے تعالٰے
نے رحمت کو منافقوں کے دلوں سے نکالدی۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں اُسکو
جگہ دی ہے۔ پھر حضرت نے اُن کو سو درہم دیکر وہ اونٹ اُن سے خرید
لیا۔ اور اُس سے فرمایا اے اونٹ چلا جا۔ تجھے اللہ کے واسطے ہم نے
آزاد کردیا انتہٰی ملخصاً۔

دیکھئے پناہ لینے کا طریقہ ہے۔ جب اونٹ نے دیکھا کہ جان کی خیر نہیں اور بغیر کسی زبردست پناہ کے مالکوں کے ہاتھ سے نجات نہیں مل سکتی تو ایسی زبردست پناہ میں آگیا جو دونوں عالم میں پشت وپناہ ہیں۔ اور چونکہ صدق دل سے اس نے پناہ لی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُسے اپنی پناہ میں لے کر نجات دلوا دی۔ حاصل یہ ہے کہ شیطان جب تک ایسا دشمن نہ مانا جائے کہ ہم اُس کے مقابلہ سے عاجز ہیں۔ خدائے تعالےٰ کی پناہ میں جانے کی ضرورت نہ سمجھی جائے گی۔ ہمارے زمانے کے بعض واعظین حضرات پہلے تو شیطان کا نام ہی نہیں لیتے اگر لیتے ہیں تو ایسی مواقع کے ضمن میں کہ شیطان کے وہاں پر جلتے تھے۔ مثلاً اگر بزرگان دین کے حکایات کے ضمن میں کہ شیطان کو اُنہوں نے ذلیل وخوار کر دیا تھا اور ایسے حکایات اور واقعات بیان کئے جاتے ہیں کہ شیطان بالکل بے وقعت ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سننے والے بالکل بے خوف ہو جاتے ہیں۔ اور قرآن شریف میں جس قدر اُس سے ڈرایا گیا ہے بے سود ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ رحمت الٰہی بہت وسیع ہے اور شفاعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی گنہگاران امت کے لئے ضرور ہوگی مگر یہ کیونکر یقین ہو کہ پہلے ہی شفاعت میں ہم ضرور شریک ہونگے یہ اشتباہ ہو گیا تو ہر ایمان والے کو یہ فکر لگی رہنی چاہیئے کہ معلوم نہیں کہ ہم کس زمرہ میں ہونگے اور حتی المقدور ظلم اور مخالفت خدا اور رسول سے بچنا عقلاً ضرور ہوگا

شیطان سے کما حقہ بیان کرنے کی ضرورت

کیونکہ سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی معصوم نہیں اور حقوق اللہ سے زیادہ
اُن کو حقوق الناس کا خوف رہتا ہے کہ کہیں ہم پر کسی آدمی کا حق باقی نہ رہ جائے
جس کا مواخذہ قیامت میں ہو۔ کیونکہ قیامت میں جب حساب و کتاب ہوگا تو
حقدار کا حق اس طرح دلایا جائے گا کہ جس پر اُس کا حق ہو اس کی نیکیاں حقدار
کو دلائی جائیں گی اور اگر نیکیاں کافی نہ ہوں تو حقدار کے گناہ اس کے اعمال میں بھرتی
کئے جائیں گے جس سے اس کی سبکدوشی ہو۔ اگر کتب احادیث دیکھی جائیں تو معلوم
ہوگا کہ ایک ایک گناہ سے متعلق کیسے کیسے عذاب بیان فرمائے ہیں۔

اب غور کیا جائے کہ جب حضرت نے ہمیشہ بُرے کاموں سے منع اور ان کے
مرتکبوں کے لئے خاص خاص قسم کے عذاب بیان فرمائے تو کیا نعوذ باللہ حضرت کا
یہ فعل عبث ہو سکتا ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی
مجلس میں لوگوں سے فرمایا ہو کہ فلاں کام کرنے والے کو اس قسم کا عذاب ہوگا
اور کوئی شخص اُن لوگوں سے کہتا کہ مسلمانوں کو کچھ عذاب نہ ہوگا یہ صرف دھمکی اور
ڈرانے کے لئے فرماتے ہیں اور اس کی اطلاع حضرت کو ہو جاتی تو کیا حضرت
اُس شخص سے راضی رہتے؟ عقل تو یہ ہرگز قبول نہیں کرتی کہ جس کام کا حضرت صلعم
بہ نفس نفیس اہتمام فرماویں اور کوئی شخص اُس کے خلاف میں گفتگو کرے وہ
خلاف مرضی نہ ہو۔ جب ہم جانتے ہیں کہ اب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کو اپنے امتیوں کے کاموں کی اطلاع ہوتی ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس

قسم کی گفتگو کہ گناہ کرنے سے مسلمانوں کو کچھ ضرر نہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مرضی ضرور ہوتی ہے۔ اور علاوہ اُس کے اُس کا بُرا اثر تمدن پر پڑتا ہی کہ مسلمان جو جی چاہے کریں اُن کو سب معاف ہے حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی غرض سے مبعوث ہوئے تھے کہ دنیا میں امن وامان قائم کرکے اس کو مزرعۃ الآخرہ بنائیں۔ اور امن وامان بغیر اصلاح تمدن کے ممکن نہیں۔

اب ہم چند حدیثیں بطور مشتے نمونہ نقل کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا کہ خدا ورسول کو عبادات اور اصلاح تمدن میں کس قدر اہتمام ہے۔

ترغیب وترہیب میں امام منذری رح نے کتب صحاح وغیرہ سے روایات ذیل کو نقل کئے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شرک وکفر میں فقط نماز کا فرق ہے یعنی اگر نماز ترک کردی جائے تو آدمی مشرک اور کافر ہوجاتا ہی بلکہ یہ بھی صاف فرمایا کہ جو شخص قصداً نماز ترک کرے وہ کافر ہوگیا۔ اور فرمایا کہ چار چیزوں کو خدائے تعالےٰ نے اسلام میں فرض کیا ہے رمضان کے روزے۔ حج۔ زکوۃ۔ نماز۔ اگر کوئی شخص ان میں سے تین کو بھی ادا کرے کچھ فائدہ نہیں جب تک چاروں کو بجا نہ لائے۔

اور فرمایا جو شخص نماز کی محافظت نہ کرے یعنی ہر نماز کو وقت پر ادا نہ کرے وہ قیامت کے روز قارون۔ فرعون۔ ہامان اور ابی ابن خلف کے ساتھ ہوگا یعنی بجائے اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرہ میں اُس کا حشر ہو

چند احادیث نبوی

کفار

کفار کے ساتھ اُس کا حشر ہوگا۔

اور فرمایا کہ جس شخص کے پاس سونا اور چاندی ہو اور وہ اُس کی زکوٰۃ نہ دے تو قیامت کے روز اُس کی تختیاں بنائی جائیں گی اور اُن کو دوزخ کی آگ میں گرم کر کے اُن سے اُس کی پیشانی اور بازو اور پیٹ کو داغ دیتے جائیں گے۔ جب وہ ٹھنڈے ہونے لگیں گے تو پھر گرم کرتے جائیں گے۔ یہ عذاب دن بھر ہوتا رہے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے۔ اُس کے بعد دوزخی ہو تو دوزخ میں ڈال دیا جائیگا۔ اور جنتی ہو تو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اور فرمایا کہ جو گوشت اور خون مالِ حرام کے کھانے سے پیدا ہو وہ جنت میں نہ جائیگا بلکہ نارِ جہنم کا وہ مستحق ہے۔

اور فرمایا جو شخص قسم کھا کر کچھ مال حاصل کرے یا کسی کا حق تلف کرے تو دوزخ اُس کے لئے واجب ہوگی۔

اور فرمایا۔ چار قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کو اللہ تعالےٰ جنت میں نہ داخل کریگا اور نہ اُس کی کوئی نعمت اُن کو چکھائے گا (۱) شرابی (۲) ربوا یعنی سود کھانے والا (۳) ماں باپ کا نافرمان اور فرمایا کسی مسلمان کی بے عزتی کرنی ربوا سے بڑھکر گناہ ہے۔ اور فرمایا جس حاکم کا جور اور بے انصافی اُس کے عدل پر غالب ہو اُس کا مقام دوزخ ہے۔

اور فرمایا کہ جسکو کوئی کام مسلمانوں سے متعلق تفویض کیا جائے اور وہ اُن میں

عدل اور انصاف نہ کرے حق تعالیٰ اُس کو دوزخ میں اوندھا ڈالے گا۔

اور فرمایا کہ رشوت دینے والا اور لینے والا اور جو رشوت پہنچانے میں واسطہ ہو ان سب پر خدا کی لعنت ہے یعنی آخرت میں رحمت الٰہی سے دور رہیں۔

اور فرمایا کہ رشوت دینے اور لینے والے دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

اور فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے۔ صحابہ نے عرض کی ہم تو اُسی کو مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ اور متاع نہ ہو۔

فرمایا۔ میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں ایسی حالت سے اُٹھے کہ اُس کے اعمال میں نماز روزہ اور زکوٰۃ سب کچھ موجود ہیں مگر اسکی حالت دنیا میں یہ تھی کہ کسی کو گالی دی۔ کسی کا مال کھا گیا۔ کسی کو مارا۔ کسی کا خون بہایا وہاں سب اہل حقوق آئیں گے اور ہر ایک کو اُس کی نیکیاں دی جائیں گی اور کل حقوق کی ادائی سے پہلے اگر اُس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو اہل حقوق کے گناہ اُس پر ڈالے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ دوزخ میں ڈالا جائیگا۔

مطلب یہ کہ کوئی نیک کام اُس کے کام نہ آئے گا۔

اور فرمایا جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اُس کی مدد کی غرض سے چلے اور وہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے یعنی حق پر نہیں ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

اور فرمایا جو شخص بادشاہ کو ایسی بات سے راضی کرے جس میں خدائے تعالیٰ کی ناخوشی ہو وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔

اور فرمایا جو شخص مسلمان کے ضرر پر ایسی گواہی دے جو اُس کے لائق نہیں تو چاہیئے کہ وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے انتہی۔

مطلب یہ کہ کوئی الزام ناحق مسلمان کے ذمہ لگانے والا گویا اپنے اختیار سے دوزخ میں جگہ لے لیتا ہے۔

اور فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینے والا میدان حشر میں قبل اس کے کہ اپنے مقام سے ہٹے۔ حق تعالےٰ اُس کے لئے دوزخ واجب کردیگا۔ اور وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اور فرمایا جو شخص کسی مقدمہ کو جانتا ہے اور گواہی کے لئے بُلانے پر بھی واقعہ کو چھپادے اور گواہی نہ دے اُس کی بھی وہی سزا ہوگی جو جھوٹی گواہی کی سزا ہے

اور فرمایا کہ خدائے تعالےٰ نے شراب سے متعلق دس شخصوں کو اپنی رحمت سے دور کردیا ہے (۱) نچوڑنے والا (۲) جس نے اُس کی فرمائش کی (۳) پینے والا (۴) لانے والا (۵) جس کے واسطے وہ لائی گئی (۶) سباقی (۷) بیچنے والا (۸) اُس کی قیمت لینے والا (۹) خریدنے والا (۱۰) جس کیلئے وہ خریدی گئی۔

اور فرمایا شرابی کو مرنے کے بعد نہر غوطہ سے پلایا جائے گا۔ صحابہ نے عرض کی نہر غوطہ کیا چیز ہے۔ فرمایا دوزخ میں زنا کار عورتوں کے فرجوں سے رطوبتیں بہینگی جس کی بدبو سے تمام دوزخیوں کو اذیت پہنچے گی وہ رطوبتیں

شرابیوں کو پلائی جائیں گی۔

اور فرمایا کہ خدائے تعالیٰ پر حق ہے کہ شرابی کو نہر خبال سے پلائے صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلعم نہر خبال کیا چیز ہے۔ فرمایا۔ دوزخیوں کی پیپ وغیرہ آلائش بہنے کی جگہ۔

اور فرمایا زنا کرنے والوں کے چہرے آگ سے ایسے جلتے رہیں گے جیسی مشعلیں۔

اور فرمایا زنا کرنے والا بت پرست کے جیسا ہے۔ انتہیٰ۔

بتوں کو پوجنے والوں کی جو سزائیں ہیں محتاج بیان نہیں۔

اور فرمایا۔ لوگوں کو دھوکے دینے والے اور احسان جتانے والے اور بخیل جنت میں داخل نہ ہونگے۔

اور فرمایا بندہ حسن خلق کی وجہ سے آخرت کے بڑے درجوں اور بلند مقاموں تک پہنچتا ہے۔

اور بدخلقی کی وجہ سے اُس درجہ تک پہنچ جاتا ہے جو دوزخ میں سب سے نیچے ہے۔

اور فرمایا بدخلقی سے بدتر کوئی گناہ نہیں۔

اور فرمایا۔ دو شخص تین روز سے زیادہ ترک ملاقات کریں اور بات چیت موقوف کریں۔ اور اسی حالت پر مرجائیں تو وہ دوزخ میں داخل ہونگے۔ ایکبار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

جنت البقیع کو تشریف لے گئے جو مدینۂ طیبہ میں مسلمانوں کا مقبرہ ہے۔ اور ایک مقام پر کھڑے ہو گئے جہاں دو قبریں نئی بنی تھیں۔ اور پوچھا کیا فلاں فلاں شخصوں کو تم نے ان قبروں میں دفن کیا ہے۔ صحابہ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ حضرت نے فرمایا فلاں شخص بٹھلایا گیا ہے۔ اور خدا کی قسم اُس پر اس قدر مار پڑی کہ اُس کا ہر عضو ٹوٹ گیا۔ اور اس کی قبر میں آگ بھر گئی ہے اور اُس نے اس زور سے چیخا کہ سوائے انس و جن کے سب نے سُنا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ اُن کا کیا گناہ تھا۔ فرمایا ایک شخص لوگوں کی غیبت کرتا تھا۔ اور دوسرا پیشاب سے آپ اپنے کو بچاتا نہ تھا۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ کب تک اُن پر عذاب ہوتا رہے گا۔ فرمایا اس کا حال سوائے خدا کے کسی کو نہیں معلوم۔

اور فرمایا جو شخص لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے ایسی بات کہے جو مرضی الٰہی کے خلاف اور باعث غضب ہو تو خدائے تعالیٰ اُس سے کبھی راضی نہ ہوگا جب تک اُس کو دوزخ میں نہ ڈالے۔

اور فرمایا۔ حسد نیکیوں کو ایسا کھا جاتا ہے جیسے آگ گھاس کو۔

اور فرمایا۔ جو شخص سخت گو متکبر ہے وہ دوزخی ہے۔

اور فرمایا دوزخ میں یہ لوگ داخل ہونگے (۱) حاکم جو لوگوں پر مسلط ہو گیا ہو یعنی زبردستی اور ظلم کرتا ہو (۲) وہ مالدار جو مال سے متعلق حقوق اللہ کو ادا نہیں کرتا (۳) فخر کرنے والا فقیر۔

اور فرمایا - جس کے دل میں رائی برابر تکبر ہو اُس کو خدائے تعالےٰ دوزخ میں ڈالے گا -

اور فرمایا - ایماندار میں اور دوسری خصلتیں ہونگی مگر خیانت اور جھوٹ نہیں ہو سکتیں

اور فرمایا جھوٹ منہ کو کالا کرنے والا ہے - اور چغلی باعث عذاب قبر ہے -

اور فرمایا - جس میں امانت داری نہیں اُس میں ایمان نہیں - اور جس کو عہد اقرار کی پابندی نہیں اُس کو دین نہیں -

یہ تمام وعیدیں مسلمانوں سے متعلق ہیں - کیونکہ نماز - روزہ وغیرہ فروع ہیں - اور جب تک خدا اور رسول پر ایمان نہ لائے اُس سے یہ احکام متعلق نہیں ہوتے اب اگر یہ خیال کیا جائے کہ کوئی مسلمان دوزخ میں نہ جائے گا خواہ کتنے ہی گناہ کرے تو قرآن و حدیث کی تکذیب لازم آتی ہے - عقل بھی ہرگز یہ گوارا نہیں کرتی کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کا مال زبردستی سے لے لے اور اُس کی عورت بچوں پر قابض ہو جائے اور اقسام کی ایذائیں اُن کو دے - اور اُن کی بے حرمتی کرے باوجود اس کے اُس عالم میں کوئی سزا اُس کو نہ ہو - حکماء نے اصلاح تمدن کیلئے تناسخ کا مسئلہ نکالا کہ جو شخص بُرے کام کرے - مرنے کے بعد کسی ایسے جانور کے قالب میں اس کی روح جائے گی - جو نہایت ذلیل ہو - اُن کا مقصود اس سے یہی تھا کہ آدمی اس خوف کے مارے بُرے کام کا مرتکب نہ ہو - یہ اُن کی تراشی ہوئی بات تھی - مگر اس کا یہ اثر ہوا کہ کروڑہا آدمی اس خیال سے کہ مرنے کے بعد کسی بُرے

اصلاح تمدن

جہنم میں نہ جائیں بُرے کاموں سے بچنے لگے۔ خالق عالم نے کارخانۂ عالم کی بنیاد ہی ایسی ڈالی کہ اگر آدمی ذرا بھی اُس میں غور و فکر کرے تو بُرے کاموںکو چھوڑ دے۔ چنانچہ دو عالم پیدا کئے ایک دار العمل۔ دوسرا دار الجزاء۔ جہاں جنت و دوزخ ہیں۔

دار العمل میں جیسے کام کریں گے دار الجزاء میں ویسا بدلا ملے گا۔ اور پیغمبروں کو بھیجکر معلوم کروادیا کہ اچھے کام یہ ہیں اور بُرے کام یہ۔ اور قرآن شریف میں جگہ جگہ خبر دی کہ بُرے کاموں کی جزا اُس عالم میں دوزخ ہے۔

اب اگر یہ باور کرایا جائے کہ مسلمان جو چاہیں کریں وہ دوزخ میں نہ جائینگے بلکہ بمصداق اس کے

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو ٭ کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

عابدوں اور زاہدوں سے بھی جنت میں اس کے مرتبے بڑھے ہوئے رہینگے۔ تو مسلمانوں کا تمدن ہندؤں کے تمدن سے بدرجہا گھٹا ہوا رہیگا کیونکہ مسلمانوں کے پیشوا یعنی واعظین نے ان کو اپنے کاموں کی جزا و سزا سے بے فکر بنادیا تو اب ان کو کیا ضرورت کہ نفس کی مخالفت کرکے دنیوی نعمتوں اور عیش و عشرت سے محروم رہیں۔ جب موقع ملیگا ناجائز ذرائع سے لوگوں کا مال حاصل کریں گے اور شہوت و نفسانی خواہشوں کو پورے کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کرینگے۔ اب کہئے کہ ایسے مسلمانوں سے تمدن

کو نفع پہنچے گا یا نقصان۔ پھر غیر اقوام کے مقابلہ میں جو کہا جاتا ہے کہ اسلام اعلیٰ درجہ کا حامی تمدن ہے تو اگر وہ ایسے مسلمانوں کو پیش کردیں کہ جن کے ناشائستہ افعال سے تمدن خراب ہو رہا ہے تو ان کا کیا جواب۔ اگر کہا جائے کہ یہ اُن کی ذاتی خرابیوں کا اثر ہے۔ ہمارا دین اُن کو ایسے امور کی ہدایت نہیں کرتا تو وہ واعظین کو پیش کردیں گے کہ اُن کی ہدایتوں کا یہ اثر ہو رہا ہے کہ لوگ بے باک ہو رہے ہیں۔ ان کو یقین دلایا جاتا ہے کہ کیسے ہی کیسے بُرے کام کریں جنت کے اعلیٰ مقامات کے مستحق ہیں۔ وہ ضرور کہیں گے کہ اگر دین میں یہ بات داخل نہیں تو یہ پیشوایان دین پھر کہاں سے ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جس سے تمدن تباہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاذ اللہ ہمارا دین اسلام کامل نہیں۔ یہ سب خرابیاں اسی وجہ سے ہیں کہ واعظین قرآن و حدیث کے کل مضامین کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ قرآن شریف کو جہاں دیکھئے یہی ثابت ہوگا کہ وعدہ اور وعید برابر ہو رہے ہیں۔ جس آیت سے امید بڑھتی ہے تو اُس کے ساتھ ہی دوسری آیت سے خوف پیدا ہوتا ہے۔ احادیث میں دیکھئے تو اُن میں بھی یہی طریقہ مرعی ہے۔ الحاصل جب تک ہمارے واعظین جو پیشوایان قوم ہیں جس طرح آیات و احادیث رجا کے بیان کرتے ہیں خوف پیدا کرنے والے آیات و احادیث نہ بیان کریں تو مسلمانوں کے تمدن کی اصلاح ہرگز نہیں ہوسکتی۔

ان حضرات کو اس آیت شریفہ میں غور کرنا چاہیئے۔ جو حق تعالیٰ فرماتا ہے

واتقوا اللہ

واتقوا اللہ حق تقاتہ ۔ یعنی خدائے تعالےٰ سے ڈر وجو ڈرنے کا حق ہے
ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب بین الخوف والرجاء
ہے نہ اس میں افراط ہے کہ گنہگار قطعی دوزخی اور ہمیشہ دوزخ میں رہے گا
جیسے خوارج کہتے ہیں اور نہ یہ ہے کہ مسلمان کو گناہوں کی کچھ سزا نہ ہوگی ۔ جیسا کہ
مرجیہ کہتے ہیں ۔ مسلمانوں کو خوف اس وجہ سے لگا رہتا ہے کہ کسی آیت و حدیث
میں یہ وارد نہیں ہے کہ کل امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالکلیہ دوزخ سے
نجات دلادیں گے اور کوئی دوزخ میں نہ جائے گا ۔ بلکہ یہ وارد ہے کہ بہت سے
مسلمان بغیر اطلاع آپ کے دوزخ میں ڈال دئے جائیں گے ۔ اور مدتوں اس میں
پڑے رہیں گے ۔ پھر جب آپ کو اطلاع ہوگی تو آپ دوزخ پر تشریف فرما ہوکر
ان کو اس میں سے نکال لیں گے ۔ اب یہ کیونکر یقین ہو کہ پہلی ہی شفاعت میں
ہم ضرور شریک ہوں گے ۔ جب یہ اشتباہ ہو گیا تو ہر ایمان والے کو یہ فکر لگی
رہنی چاہئیے کہ معلوم نہیں ہم کس زمرہ میں ہوں گے ۔

آج کل کے بعض مہذب مسلمان جب اس قسم کے احادیث کو سنتے ہیں تو کہتے
ہیں کہ یہ اوہام پرستی ہے کہ جنت اور دوزخ کے خیال سے عبادت کی جائے ۔ اگر
اس کا مطلب یہ ہے کہ عقلا بالطبع اچھے کام کرتے ہیں ۔ اور برے کاموں سے
احتراز کرتے ہیں تو یہ درست ہے ۔ مگر سب آدمی یکساں اور اس خیال کے
نہیں ہوسکتے ۔ شاید ہزار میں ایک آدمی ایسا بلند خیال ہوگا ۔ باقی اپنے

شہوات اور خواہشیں پوری کرنے میں اس کا خیال ہی نہیں کرتے کہ کونسا کام مقتضائے عقل ہے اور کونسا خلاف عقل۔ انہیں لوگوں سے تمدن خراب ہوتا ہے۔ چونکہ ان لوگوں کی ہمت نفسانی خواہشوں کے پوری کرنے اور جسمانی لذات حاصل کرنے کی طرف مصروف ہے۔ اس لئے ان کو وعدہ دیا گیا کہ جتنی خواہشیں تمہاری تھیں جنت میں ایسے طور پر پوری ہونگی کہ وہ تمہارے خیال میں بھی نہیں ہے۔ بشرطیکہ جن کاموں کا حکم کیا گیا ہے وہ بجا لائیں اور برے کاموں سے احتراز کریں اور اگر اُس کے خلاف کروگے تو دوزخ میں ڈالے جاؤگے جہاں ایسے قسام کے عذاب ہیں کہ دنیا میں ان کا خیال تک نہیں آسکتا۔ جن لوگوں کو خدائے تعالےٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا ایمان ہے اور کلام الٰہی اور احادیث نبوی کو سچا جانتے ہیں وہ یقین کرکے ایسے کام کرتے ہیں جن سے جنت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے اور جو یقین نہیں کرتے وہ دوزخ کے مستحق ہوتے ہیں۔ غرض کہ یہ ترغیب و تخویف ایسے ہی لوگوں کے واسطے ہے اور عالی فطرتوں کے لئے اُس کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے بادشاہی ملازمین میں بعض لوگ اس فطرت کے ہوتے ہیں کہ حسب مرضی شاہی سب کاموں کو انجام دیتے ہیں جس کی وجہ سے اُنہیں تقرب حاصل ہوتا ہے۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں بخلاف اُس کے بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کو اضافۂ ماہوار وغیرہ کے ترغیب دینے کی اور اُن کے تخویف کے لئے قید خانہ بنانے کی

ضرورت ہوتی ہے جہاں اقسام کے عذاب دئے جاتے ہیں۔ اسی پر خدائی سلطنت کا خیال کیا جائے۔

اہل تہذیب جدیدہ اگرچہ اعلیٰ درجے کی بات کہتے ہیں کہ اعمال حسنہ وسیئہ کے لئے خوف ورجا اس قسم کی نہونی چاہئیے بلکہ جو کام ہو خلوص سے خاص خدائے تعالیٰ کی رضامندی کے لئے ہو چنانچہ اکثر اولیاء اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ اولیاء اللہ جنت ودوزخ کے قائل ہیں۔ بخلاف اس کے ان حضرات کا اندرونی منشا کچھ اور ہی ہے اکثر حکما کا یہی مسلک ہے کہ جنت ودوزخ کوئی چیز نہیں صرف روحانی لذائذ جو روحانیت کی تکمیل سے حاصل ہوتے ہیں ان کا نام جنت اور روحانی تکالیف کا نام دوزخ ہے جو روحانی کمالات حاصل نہ کرنے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

ماہیت جنت ودوزخ

حکما کی غرض یہی معلوم ہوتی ہے کہ زمین ایک بڑی مستحکم چیز ہے جب ایک بار بن گئی تو اس کو خراب کرکے دوسرا عالم قائم کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اس لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ دنیا کا کارخانہ یوں ہی چلنے دینا چاہئیے کہ ہمیشہ لوگ پیدا ہوتے رہیں اور آخرت کا کارخانہ علحدہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں صرف روح جہاں رہے وہیں اس کے لئے آسائش یا تکلیف رہے جسکو انبیا جنت ودوزخ سے تعبیر کرتے ہیں انہوں نے دیکھا کہ جب عالم کا کارخانہ ایک مدت سے جاری ہے اور کوئی ایسا شخص انہیں نہ ملا کہ اس کے روبرو

تخلیق عالم ہوئی ہو۔ اس لئے اُنہوں نے یہ خیال کیا کہ عالم قدیم ہے۔ اور یہ بھی تجویز کرلی کہ وہ کبھی فنا نہ ہوگا۔ یہ صرف اُن کا قیاس ہے۔ اور چونکہ وہ قیاس غائب علی الشاہد ہے اس لئے عقلاً جائز نہیں ہوسکتا اور جتنے دلائل قائم کئے گئے ہیں اُن میں کوئی دلیل ایسی نہیں جس کو عقل سلیم قبول کرسکے کیونکہ یہ مسئلہ نظری ہے جس میں نظر و فکر کی ضرورت ہے۔ اور یہ بات قابل تسلیم ہے کہ جب تک نظریات کی انتہا کسی بدیہی پر نہ ہو دلیل مفید نہیں ہوسکتی۔ اب یہاں کونسی چیز ایسی بدیہی نکل سکے گی جس کے ذریعہ سے ہم قِدم عالم تک پہنچ سکیں۔ غرض کہ عقل سے عالم کے قِدم اور ابد کی راہ طے کرنی محالات سے ہے بخلاف اُس کے جب ہم نے عقل کی رہبری سے مان لیا کہ عالم کا پیدا کرنے والا ایک ہے۔ جس نے ہماری ہدایت کے لئے نبی بھیجا اور اُس پر قرآن نازل کیا اور اسی میں فرمایا کہ ہم نے اپنی قدرت سے آسمان و زمین پیدا کئے تو اب ہمیں اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ آسمان و زمین حادث ہیں۔ اور ان کو خدائے تعالیٰ نے اپنے ارادہ سے جب چاہا بنایا۔ حکما نے عالم کو بڑی وقعت دے رکھی ہے یہانتک کہ کہتے ہیں جب سے خدا ہے عالم بھی اس کے ساتھ ہے بلکہ بعض نے تو کہا کہ خدا کی بھی ضرورت نہیں عالم خود بخود پیدا ہو گیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب نگاہ پڑتی ہے تو عالم ہی پر پڑتی ہے اور خدائے تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ اور جس قدر اُس کی قدرتیں ظاہر

ہوتی ہیں

ہوتی ہیں اشیاء عالم میں ہوتی ہیں۔ اس لئے خالق تک نظر پہنچنے کی ظاہراً کوئی صورت نہ تھی۔ البتہ بعض حکما جن کو اعلیٰ درجے کی عقل دی گئی تھی ان کی عقلوں نے رسائی کی اور سمجھ گئے کہ نہ عالم خود بخود بن سکتا ہے نہ اپنے میں خوبیاں اپنے آپ سے پیدا کر سکتا ہے بلکہ پیدا کرنے والا اور تمام کا کام چلانے والا کوئی اور ہی ہے بہرحال ان کو بھی بعض امور میں غلطیاں ہوئیں کیونکہ عقل کہاں تک چل سکے اس کے حد امکان میں اسی قدر ہے کہ تخمین سے کام لے۔ اور ظاہر ہے کہ تخمین کوئی اعتبار کے قابل چیز نہیں۔ غرض کہ حکما نے عالم کو جس قدر وقعت دے رکھی ہے وہ صحیح نہیں۔ کیونکہ وہ مخلوق ہے اور ممکن نہیں کہ مخلوق خالق سے برابری اور ہمسری کا دعوے کر سکے۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ ہم مکان یا اور کوئی چیز بناتے ہیں تو باوجودیکہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اُس کے خالق ہیں۔ کیونکہ مکان کے لئے مثلاً لکڑی چونا پتھر وغیرہ اشیا جب تک پہلے سے موجود نہ ہوں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ان سب کا خالق خدائے تعالےٰ ہے۔ ہمارا کام صرف اس قدر ہے کہ اُن اشیاء کو خاص طور پر ایک جگہ جمع کر دیں۔ جس پر مکان کا اطلاق ہو سکے۔ اب دیکھئے کہ باوجود خالق نہ ہونے کے اُن اشیاء کا ہمارے روبرو کیا حال ہے جس طرح چاہتے ہیں لکڑی اور پتھر کو تراشتے ہیں۔ اور جہاں چاہتے ہیں ان کو لگاتے ہیں۔ کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مثلاً ایک پتھر کو ہم پائخانہ میں لگانا چاہیں۔ اور وہ انکار کرے۔ اب دیکھئے کہ باوجودیکہ یہ اشیاء موجود

اور ہمارے ہمسر ہیں۔ اس وجہ سے کہ جس طرح خدائے تعالے نے ہمیں پیدا کیا انہیں بھی پیدا کیا۔ مگر چونکہ ہم کو اُن پر ایک قسم کا تسلط دیا گیا ہے۔ وہ ہم سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ اور ہماری قدرت سے مکان وجود میں آجاتا ہے۔ اسی پر غور کیجئے کہ مخلوق کو خالق کے ساتھ کسی قسم کی ہمسری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ بالذات موجود ہے۔ اور یہ معدوم۔ جب خالق کسی شئے کو عدم سے وجود میں لانا چاہتا ہے تو وہ شئے اُس کے روبرو اس سے بھی زیادہ ذلیل اور منقاد ہے جو ہمارے روبرو مکان کے اجزا ہوتے ہیں۔ صرف خدائے تعالے کا ارادہ ہونے کی دیر ہے۔ جہاں کسی چیز کے پیدا کرنے سے ارادہ متعلق ہوا تو پھر ممکن نہیں کہ وہ چیز وجود میں نہ آئے یا آنے میں تاخیر کرے۔ کیونکہ اگر کسی چیز کے بننے میں تاخیر ہوتی ہے تو وہ بنانے والے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بنانے والا ذی اثر اور باقدرت ہو تو وہ چیز بہت جلد تیار ہوگی۔ مثلاً معمولی مقدرت والا جس مکان کو ایک مہینے میں بنا سکتا ہے تو مقدرت والا اگر چاہے تو دو تین روز میں بنالیگا۔ مخلوق اگر کسی چیز کو بنائے تو خواہ مخواہ دیر ہوگی۔ کیونکہ آلات و اسباب فراہم کرنے میں ضرور دیر ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر خالق عزوجل جب کسی چیز کو بنانا چاہتا ہے تو وہاں نہ آلات کی ضرورت ہوتی ہے نہ اسباب کی بلکہ فقط موجود ہوجا کہدینا کافی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے انما قولنا لشیء اذا اردناہ ان نقول لہ کن فیکون۔ اب غور کیجئے کہ مخلوق کس قدر خالق کے

روبرو ذلیل اور منقاد ہے۔ کہ صرف کن کہدینے سے وجود میں آجاتی ہے جب ہر چیز کا یہی حال ہے جن کا مجموعہ عالم ہے تو ظاہر ہے کہ عالم خدائے تعالٰی کے روبرو نہایت ذلیل اور منقاد ہے۔ اور اُس کی ہستی ہی کیا کہ خدائے تعالٰی کی ہمسری کا دعوے کر سکے۔ غرض کہ عقلاً یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ عالم کو خدائے تعالٰی کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں۔ بلکہ نہایت ذلیل حالت میں ہے۔ صرف ایک لفظ کے کہنے سے وجود میں آسکتا ہے اور ایک لفظ کے کہنے سے فنا ہو سکتا ہے۔ جب یہ بات قابل تسلیم ہے تو کہنا پڑے گا کہ خدائے تعالٰی نے جس طرح اپنے ارادہ اور اختیار سے عالم کو موجود کیا اسی طرح اُس کو اپنے ارادہ اور اختیار سے فنا بھی کر سکتا ہے۔ جس کی خبر قرآن شریف میں دی ہے۔ اس کے بعد یہ خیال کرنا کہ زمین و آسمان ہمیشہ باقی اور روحانی دنیا کے لئے کوئی ٹھکانے یعنی جنت و دوزخ کی ضرورت نہیں یہ قرآن شریف کی تکذیب کرنی ہے۔

ب

(ب) یہ حرف جار ہے اور وہ جس پر داخل ہوتا ہے اُس کو مجرور کہتے ہیں جار لغت میں کھینچنے والے کو کہتے ہیں اور مجرور وہ جو کھینچا جائے۔ جار مجرور کا تعلق کسی فعل سے یا صیغہ صفت سے ہوتا ہے۔ اگر ظاہر کوئی فعل یا صیغہ صفت نہ ہو تو اس کو مقدر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جیسے (زید فی الدار) میں ثبت

یا ثابت فی الدار سمجھا جاتا ہے۔ جب تک جار مجرور کا تعلق فعل یا صیغۂ صفت سے
نہ ہو عبارت درست نہیں ہو سکتی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ عبارت کا ایک عالم ہی
جدا اور مستقل ہے۔ جس میں بے انتہا افراد موجود ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں اس
عالم کا تعلق فہم و ادراک اور سامعہ سے ہے اور بواسطۂ نقوش باصرہ سے بھی ہو سکتا
ہے۔ باقی دوسرے حواس کو اس عالم میں رسائی نہیں یہ عالم عبارت دراصل
جلوہ گاہِ عالم معنیٰ ہے یعنی معنے تنزل کر کے عالم عبارت میں آجاتا ہے۔ پھر اس
عالم میں اس کے مختلف اشکال ہوتے ہیں۔ ایک شکل کو دوسری شکل سے کوئی
مناسبت نہیں ہوتی۔ مثلاً جب آدمی چاہتا ہے کہ کوئی اُسے پانی پلائے تو
کسی کو مخاطب کر کے ہندی ہو تو یہ کہے گا کہ (مجھے پانی پلاؤ) اور عرب ہو تو
(اسقنی الماء) اور فارسی ہو تو (مرا آب بنوشاں) کہے گا علیٰ ہذا القیاس
ہر ملک کا آدمی اپنی زبان میں اس مضمون کو ادا کرے گا۔ اگرچہ بحسب اختلاف السنہ
صدہا قسم کی عبارتیں اس مضمون کی بنائی جائینگی۔ جس کو اس زبان کے جاننے
والوں کے سوا کوئی دوسرا نہ جانے گا۔ مگر دل میں سب کے ایک ہی قسم کی بات
ہوگی۔ یہاں شاید یہ خیال پیدا ہو گا کہ ہندی کے دل میں بھی ہندی الفاظ
ہونگے۔ مگر یہ صحیح نہیں اس لئے کہ جانور کے دل میں بھی یہ بات موجود ہوتی ہے
جیسا کہ آثار او رقرائن سے ثابت ہے حالانکہ اس کے دل میں کسی لفظ کا وجود
نہیں ہے کیونکہ لفظ (ما تیلفظ بہ الانسان) کو کہتے ہیں اس کے سوا

یہ امر بھی قابل تسلیم ہے کہ جب کوئی شخص اعتراض کرتا ہے تو بسا وقت اس کا جواب سوجھ جاتا ہے اور بمجرد اُس کے خطور کے آدمی پر آثار بشاشت نمایاں ہوتے ہیں اور فوراً مقابل کو کلام سے روک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا جواب میرے خیال میں آگیا۔ جس وقت اس جواب کا خطور ہوتا ہے اُس وقت کو اگر آدمی غور سے دیکھے تو ایک آن سے زیادہ نہ پائے گا۔ اُس آنی کلام کو کلام نفسی کہتے ہیں۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ گویا ایک بجلی ہے کہ کوندگئی اور جس مقام میں کوندی اُس کو منور کر دیا وہ کلام نفسی جو آنی ہوتا ہے جب بیان کیا جاتا ہے تو بہت دیر تک اُس کی تقریر کی جاتی ہے۔ اب کہئے کہ اُس آن میں جو جواب کا خطور ہوا یہ سب الفاظ جو دیر تک بیان کئے جاتے ہیں کہاں ہیں۔

الحاصل اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ دل میں جو مضمون آتا ہے اس کو الفاظ کی شکل نہیں ہوتی وہ ایک اجمالی کیفیت ہے مگر چونکہ اسی کو مفصل بیان کرتے ہیں اس وجہ سے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہندی ہو تو اردو الفاظ اس کے دل میں ہونگے۔ اور کوئی عرب ہو تو عربی حالانکہ یہ صحیح نہیں کیونکہ جب جانوروں کے دل میں بھی باتیں ہوتی ہیں اور الفاظ مفقود ہیں تو معلوم ہوا کہ الفاظ کا وہاں دخل نہیں ہے۔ مگر اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ کوئی چیز وہاں ضرور ہے جس کو عبارت میں لاتے ہیں اسی کو کلام نفسی کہتے ہیں۔

اب اُس کلام نفسی پر غور کیجئے کہ جس طرح عوارض جسمانی سے معرا و منزہ ہے نہ اس میں

کلام نفسی

حروف ہیں۔ جن کے بنانے میں زبان و حلق و دہان و لب کے استعمال کی ضرورت ہو اور اُن کی تقدیم و تاخیر ہو سکے۔ نہ صوت ہے جس میں ہوا کی طرف احتیاج ہووے اُس حالت تنزیہی سے وہ کلام نفسی تنزل کر کے فضائے دہن میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ حلق سے لے کر ہونٹوں تک اس کی دار السلطنت ہے اس کے تولد کی یہ کیفیت ہے کہ زبان ایک ایک جگہ لگتی جاتی ہے اور ایک ایک حصہ اس کا وجود میں آتا جاتا ہے اور بعض حصوں کو حلق اور لب وغیرہ بناتے ہیں۔

اب یہاں ایک لطف خاص قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ زبان اکثر حرکت کرتی رہتی ہے اور ان تمام مقامات پر لگتی بھی ہے۔ مگر کوئی حرف وجود میں نہیں آتا۔ جب تک حلق کے اندر سے ہوا خاص طور پر باہر نہ آئے جس سے آواز کا وجود ہو۔ غرضکہ آواز جو در اصل ہوا ہے جب حلق سے باہر آتی ہے اس وقت ان تمام حرکات زبان وغیرہ سے آواز میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے کلام کا وجود ہوتا ہے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ زبان تمام حرفوں کے مخارج پر لگنے اور حلق وغیرہ کے حرکت کرنے سے بھی حروف پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہوائے خاص یعنی آواز کے وجود سے ان سب کا ظہور ہو جاتا ہے۔ یہ بعینہ ایسا ہے جیسے اعیان ثابتہ اپنے مقام میں یعنی عدم میں رہتے ہیں اور وجود کے معیت کے ساتھ ہی ان کا ظہور ہو جاتا ہے۔ دیکھئے عالم حروف ایک محسوس عالم ہے۔ جس میں ہر ایک حرف دوسرے حروف سے متشخص اور ممتاز ہے ان حروف کا

ظہور لفظ

مثال اعیان ثابتہ

جو ظہور ہو رہا ہے صرف آواز کی بدولت ہے اگر آواز نہ ہوا اور زبان وغیرہ تمام حروف کے اعیان کو ثابت کر دیں تو بھی وہ سب معدوم ہی رہینگے۔ اس لئے کہ عالم محسوسات میں اگر ان کا وجود ہی نہ ہوا تو کسی کو خبر بھی نہ ہو گی کہ ان کا ثبوت بھی ہے یا نہیں۔ البتہ نفس ناطقہ نے جب زبان وغیرہ کی حرکت سے ان کو فی نفسہ ممتاز بنا دیا تو وہ جانتا ہے کہ کہاں کہاں کس کا تعین ہے۔ پھر جب اُن کو وجود دینا منظور ہوتا ہے تو زبان وغیرہ کو حرکت دیتا ہے جو بمنزلہ کلمہ "کن" کے ہے اور وہ آواز کی معیت سے وجود میں آجاتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ حروف کے اعیان ثابتہ اپنے مقام سے علحدہ نہیں ہوتے کیونکہ لام مثلاً جس مقام میں بنتا ہے نہ وہ مقام منہ سے باہر آیا نہ وہ کیفیت جو زبان کے اتصال مقامی سے پیدا ہوئی۔ البتہ اُس عین ثابتہ کا ظہور عالم محسوسات میں ہو جاتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ لام مثلاً عالم محسوسات میں پیدا ہو گیا حالانکہ وہ وہیں ہے جہاں اس کا ثبوت تھا۔ مگر ہوا یہ کہ آواز نے ان حروف کو عالم محسوسات میں ظاہر کر دیا۔ یہاں لطف خاص یہ ہے کہ آواز اور حروف سنے جاتے ہیں اور اصل ہوا کو کوئی سنتا ہی نہیں بلکہ وہ غیر محسوس ہے حالانکہ مدار آواز کا اسی پر ہے کیونکہ آواز ہوائے مکیّفہ کا نام ہے۔ یہی حال عالم کا ہے کہ کیفیات وجود محسوس ہیں مگر وجود محسوس نہیں۔ ہوا کا استعمال کہ کس موقع پر کتنی نکالی جائے جس سے صرف خود آپ ہی سنے یا نزدیک والا یا دور والا سن سکے ایک عجیب کام ہے اسکا

طریقہ کوئی حکیم بتا نہیں سکتا۔ بلکہ الہامی ذریعہ سے خودبخود حاصل ہو جاتا ہے۔
پھر زبان کی اعجوبہ کاریاں بھی قابل دید ہیں کہ اس سرعت کے ساتھ وہ حرف بناتی
ہے کہ اس کو دیکھکر آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ تیس چالیس مقامات پر فوراً گذر
کرکے بات کا بنانا اسی کا کام ہے اگرچہ وہ ایک مضغۂ گوشت ہے مگر نفس ناطقہ
کی تحریک سے بہت آسانی سے اپنا کام انجام دیتی ہے اور نفس ناطقہ کی کارگزاری
بھی اس وقت قابل دید ہے کہ ایک ایک حرف پر زبان کے عضلات و اوتار
وغیرہ کو کبھی کھینچ کر اور کبھی چھوڑ کر اور کبھی زبان کو پہن کرکے اور کبھی دراز کرکے
اس سرعت سے کام لیتا ہے کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ
صرف زبان ہی کی طرف اُس کی توجہ ہو بلکہ ادھر یہ کارخانہ جاری ہے اور ادھر
مضامین سوچتا رہتا ہے کہ کس مضمون پر کس عبارت کا لباس پہنایا جائے۔
یا یوں کہئے کہ ادھر کلام کے اعضا بنتا جاتا ہے اور ادھر اس میں جان پھونکتا
جاتا ہے۔ کیونکہ الفاظ میں معنی بمنزلہ جان کے ہیں۔ بہرحال یہ دونوں کام
ایک ہی وقت میں نفس ناطقہ کرتا ہے اور اُس کے ساتھ حلق سے ہوا کو
بھی نکالتا جاتا ہے۔ تاکہ جو حروف منہ میں بن رہے ہیں اس میں لپٹ کر منہ سے
باہر جائیں اور جو مقصود ہے پورا کریں۔ یہاں بھی ایک عجیب تماشا ہے کہ
جو ہوا حلق کے باریک سوراخ سے نکلتی ہے اس کے ساتھ کلام منہ کے باہر
نکلتا ہے اور نکلتے ہی اتنی ہوا پر اپنا تسلط کرلیتا ہے جو ایک وسیع میدان

میں بھری ہوتی ہے۔ اگر دس ہزار آدمی بھی اس میدان میں ہوں تو بھی حسب
قوتِ آواز کانوں میں وہ کلام چلا جاتا ہے ہرچند وہ ہوا جس میں کلام رہتا ہے
سب کے جسم سے لگی ہوئی ہے۔ مگر جسم کے کسی حصہ کو خبر نہیں ہوتی کہ اس ہوا میں
کلام ہے اگر خبر ہوتی ہے تو صرف کان کے آخری حصہ کو حالانکہ اس میں کوئی
ایسی چیز نہیں جو جسم کے کسی حصہ میں نہ ہو اگر عصب سے سماعت کا کام متعلق ہے
تو وہ بھی تمام جسم میں مفروش ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے تمام
اعصاب میں سے اُس عصب سے جو کان میں مفروش ہے سماعت کو متعلق فرما دیا
ہے جس سے کلام کی پوری حالتوں پر اس کو اطلاع ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے
کل اعضاء اس سے بے خبر ہیں کیونکہ ان کو اُس عالم سے تعلق ہی نہیں۔ ادنیٰ
تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ ایک عالم ہی مستقل ہے۔ ابتداءً بات دل میں
پیدا ہوتی ہے پھر منہ میں آکر ایک نئی شکل قبول کرتی ہے۔ پھر ہوا کے ذریعہ سے
باہر نکلتی ہے اور ایک حد معین تک سننے والوں کے کانوں میں پہنچتی ہے اور
وہاں سے اُن کے دل میں اُترتی ہے۔ ابتدا سے انتہا تک اندرونی تعلقات
اور مناسبتیں باہمی کچھ ایسی ہیں کہ اُن کے ادراک سے عقل قاصر ہے کیا یہ بات
سمجھ میں آتی ہے کہ عصب یعنی پٹھہ سنتا ہے یا سننے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔
بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کو کان بھی ہیں اور کان میں پٹھے بھی ہیں۔ مگر
سماعت مفقود۔ اور زبان بھی ہے اور حرکت بھی کرتی ہے۔ مگر بات کے بنائی کی

صلاحیت ندارد۔ عقلا نے بات کو مقید کرنے کا آلہ تو بنا لیا ہے مگر اب تک کوئی ایسا آلہ تیار نہ ہو سکا کہ اپنے دل کی بات اس کے ذریعہ سے بیان کریں حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ حلق سے ہوا نکلتی ہے اور چند کھٹکوں سے حروف تیار ہوتے ہیں۔ اور ہوا کے ذریعہ سے وہ کان تک پہنچتے ہیں۔ ہوا موجود ہے اور ربڑ کی زبان بھی بنا سکتے ہیں اور ہوا کو توجہ دینے کی تدابیر بھی معلوم ہیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ منہ کی شکل بنا کر اس سے بات کر لیں اگر ایسا آلہ نکالا جائے تو گنگوں کو بہت بڑا فائدہ ہو۔ ایسے کام لینے کی تدابیر امریکہ وغیرہ میں اقسام کی کی جا رہی ہیں مگر اتنا سہل کام اب تک نہ ہو سکا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرف وصوت وسماعت کا عالم ہی جدا ہے جس کے اسرار پر اب تک کسی کو اطلاع نہیں۔ اس عالم میں آواز بھی ایک چیز ہے جو حلق سے نکالی جاتی ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب چاہتے ہیں کہ سوائے شخص قریب کے کوئی نہ سنے تو اس کو پست کر سکتے ہیں اور جب اوروں کو بھی سنانا منظور ہوتا ہے تو بلند کرتے ہیں۔ پھر اس میں بھی مدارج ہیں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کو سنا سکتے ہیں اب آواز کو پست و بلند کرنے والوں سے پوچھا جائے کہ کس تدبیر سے آواز پست و بلند کی جاتی ہے تو کوئی بتا نہ سکے گا۔ حکما یہ کہہ تو دیں گے کہ عضلات وغیرہ کو خاص خاص قسم کی حرکت دی جاتی ہے مگر حرکت دینے کی تدبیر کوئی نہ بتا سکیگا حالانکہ جاہل جس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ حلق میں کوئی عضلہ بھی ہوتا ہے وہ بھی

اپنی آواز کو پست و بلند کرتا ہے۔ اب کہئیے کہ اُس کو یہ تدبیر جو عمل میں لاتا ہے
کس نے بتائی نفس ناطقہ تو کیا اس کے فرشتے کو بھی معلوم نہیں کہ کس تدبیر سے
عضلات و اعصاب کو حرکت دیتے ہیں بلکہ یہ بھی خبر نہیں کہ عضلات کا وہاں وجود
بھی ہے یا یوں ہی کہا جاتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ طبیعت یہ کام کرتی ہے تو ہم
کہیں گے کہ طبیعت نفس ناطقہ کے ماتحت کام کرتی ہے جب نفس ناطقہ ہی کو
معلوم نہیں تو بے شعور طبیعت کو کیونکر معلوم ہوا۔ عقلاء کا دستور ہے کہ جس سررشتہ
کے انتظام کے لئے عملہ مقرر کرتے ہیں تو پہلے ایسے افسر اعلیٰ کی تلاش کرتے
ہیں کہ اس سررشتہ کے تمام کاموں کا ماہر ہو اور اُس کے ماتحت کے افسر اس سے
کم درجہ کے ہوتے ہیں جب حق تعالےٰ نے نفس ناطقہ کو اس سررشتہ کالبدِ
انسانی کا افسر اعلیٰ مقرر فرمایا تو اس کا علم اس کے ماتحتوں کے علم سے زیادہ
ہونا چاہئیے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ نفس ناطقہ کو اس کا علم ہی نہیں کیونکہ ہماری
جس قدر ادراکات ہیں وہ سب ہمارے نفس ناطقہ ہی کے ادراکات ہیں اگر ہمارا
نفس ناطقہ جانتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں جب اس تدبیر کو ہم نہیں
جانتے تو ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا نفس ناطقہ بھی نہیں جانتا اور جب نفس ناطقہ
ہی نہیں جانتا تو طبیعت بھی نہیں جانتی۔ کیونکہ خود حکماء کو اعتراف ہے کہ طبیعت
بے شعور محض ہے اس سے معلوم ہوا کہ عالمِ کلام کے کارخانے کو خدائے تعالیٰ
نے صرف اپنے ہی تصرف میں رکھا ہے جب چاہتا ہے بات کرا دیتا ہے گر

چونکہ عادت ہو گئی کہ ہم جب ارادہ کرتے ہیں تو بات کر لیتے ہیں اس وجہ سے خیال تک نہیں آتا کہ خدائے تعالےٰ کو بھی اس کارخانے میں دخل ہے یا نہیں یہ ہر شخص جانتا ہے کہ آدمی جب کسی ایسے کام کا ارادہ کرتا ہے جن میں آلات کے استعمال کی ضرورت ہو تو پہلے ان آلات کے استعمال کا طریقہ سیکھتا ہے اور جب تک وہ معلوم نہ ہو کام ہرگز نہیں کر سکتا۔ بخلاف اس کے بات کرنے کا ارادہ جب کرتا ہے تو بغیر اس کے کہ آلات یعنی عضلات وغیرہ کے استعمال کرنے کا طریقہ معلوم ہو بات کر لیتا ہے۔ اب کہئے کہ کیا صرف ارادہ بات کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ میری رائے میں عقل کی رو سے تو ہرگز کافی نہیں ہو سکتا کیونکہ جب معلوم ہو گیا کہ نفس ناطقہ اور طبیعت طریقۂ استعمال آلات کو جانتے ہی نہیں تو یہ کہنا پڑے گا کہ ارادہ تو ہم کرتے ہیں مگر اُس کام کا وجود کسی اور کے ارادہ سے ہوتا ہے یعنی خالق عالم اُس فعل کو وجود میں لاتا ہے اسی پر ہمارے تمام افعال کو قیاس کر لیجئے اسی وجہ سے اہل سنت وجماعت کا مذہب ہے کہ خالق افعال خدا تعالےٰ ہے اور کلام الٰہی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے واللہ خلقکم وما تعملون الحاصل جو بات کہ دل میں پوشیدہ تھی جس کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب اس کو عالم شہود میں لانا منظور ہوا تو ہوا کے ساتھ وہ مخلوط کی گئی کیونکہ عالم محسوسات بہ نسبت عالم معنی کے کثیف ہے۔ اب اُس نے اپنے مقام سے اس قدر تنزل کیا کہ ہزارہا آدمی اُس کو

مشاہدہ کرنے لگے اور محسوسات میں داخل ہوگئی۔ مگر اب بھی اُس کا مشاہدہ ایک مخصوص طور پر ہے کہ صرف کانوں کو خبر ہے آنکھ وغیرہ اعضاء کو کچھ خبر ہی نہیں کہ اُس کا وجود بھی عالم میں ہے یا نہیں کیونکہ کلام کی تجلی مختص کانوں کے ساتھ ہے اور کان بھی سب نہیں بلکہ وہی جن کو ان کا احساس دیا گیا ہے۔ اب دیکھئے کہ کلام ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ظاہر سماعت پر اور باطن اوروں پر۔ مگر یہاں یہ قیاس نہ کیا جائے کہ حق تعالےٰ کا ظہور و بطون بھی ایسا ہی ہے کیونکہ حق تعالےٰ کی ذات وصفات ایسی نہیں کہ کوئی اُن کے مشابہ ہو سکے۔ حق تعالےٰ فرماتا ہے لیس کمثلہ شیٔ کلام باطن سے تھوڑی دیر کے لئے ظہور کر کر کانوں کی راہ سے پھر باطن میں چلا جاتا ہے اور جس طرح ابتدار میں کلام نفسی تھا۔ اب بھی سامع کا کلام نفسی بن جاتا ہے اور حروف وصوت سب باہر رہ جاتے ہیں بلکہ فنا ہو جاتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حروف وصوت کی تدبیر صرف اسی غرض سے کی گئی تھی کہ دل کی بات دل میں پہنچ جائے ہم نے اوپر جو کہا تھا کہ کلام نفسی حروف وصوت سے منزہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً (پانی پلاؤ) کسی کو کہا جاتا ہے تو اس وقت صرف یہ ہوتا ہے کہ پانی کی صورت ذہن میں آتی ہے اور (پلاؤ) کی اگرچہ یہ بات بظاہر سمجھ میں نہ آئے گی کہ پلاؤ امر کا صیغہ ہے اس کی کیا صورت ہو گی۔ مگر جس وقت یہ کلام کیا جاتا ہے۔ اُس وقت نفس ناطقہ میں یہ بات ضرور ہوتی ہے۔ کہ

پلانے کی طلب وخواہش سامع سے ہوتی ہے جس کو عبارت میں لایا جائے تو لفظ (پلاؤ) یا بنوشان وغیرہ بنایا جائے گا۔ جس طرح اشیاء خارجیہ کی صورتیں ذہن میں ہوتی ہیں ایسے ہی افعال وغیرہ کی صورتیں بھی ہوتی ہیں دیکھئے پلایا اور پلاؤ کے معنی ہر شخص سمجھتا ہے کہ جدا جدا ہیں اگر اس میں ہر ایک کے معنی علحدہ نہ ہوں تو ان کے لئے علحدہ علحدہ الفاظ کیوں قرار دئے جاتے ہیں۔ بہر حال اُن الفاظ کے معنی کا تصور ہر شخص کو ضرور ہوتا ہے۔ اور جب اُن کی کوئی صورت ہی نہ ہو تو تصور کیونکر ہو سکے۔ غرضکہ پانی کی اور پلاؤ کی صورت پہلے ذہن میں آتی ہے اس طور پر کہ جملہ انشائیہ بنتا ہے اگر مخاطب اس خطاب کو سمجھ سکتا تو حرف وصوت سے کلام بنانے کی ضرورت نہ ہوتی اور مقصود پورا ہو جاتا۔ اگر فرض کیا جائے کہ دو صاحب کشفِ قلوب کسی مقام میں ہوں تو ان کو کلام لفظی بنانے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ اندر ہی اندر دونوں کی باتیں اور مخاطبہ ہوتا جائے گا جیسا کہ کسی بزرگ نے فرمایا ہے ؎

دو کس را کہ باشد بہم جان و ہوش

حکایت کنانند وایں ہا خموش

غرضکہ جو صورت کلام دل میں ہوتی ہے اس کو دوسرے کے ذہن میں منتقل کرنے کی غرض سے الفاظ بنائے جاتے ہیں گو وہ صورت کلام نفسی صورت الفاظ میں جلوہ گر ہوتی ہے وبسواری ہوا کانوں کے ذریعہ سے دوسروں کے دل میں

جاتی ہے

جاتی ہے اگر کسی میں یہ قوت ہو کہ اپنے کلام نفسی کو دوسرے کا کلام بنا سکے تو اُس کو حرف و صوت کی کوئی ضرورت نہیں چنانچہ کسی بزرگ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ خود وعظ نہیں کہتے تھے۔ مگر جب اُن سے اصرار کیا گیا تو اُنہوں نے ایک جاہل کو منبر پر بٹھا دیا اور آپ اس کی طرف متوجہ ہو گئے اُس نے ایسا فصیح و بلیغ پُر اثر وعظ کہا کہ لوگ حیران ہو گئے بعدِ وعظ جب اُس سے پوچھا گیا تو وہ ان مضامین سے بالکل ناآشنا تھا۔ انبیاعلیہم السلام پر جو وحی آتی تھی اس کا بھی یہی حال تھا کہ بذریعۂ فرشتہ اُن پر کلام نفسی الٰہی کا القا ہوتا تھا۔ جس کا ظہور کلام لفظی کے صورت میں عمل میں آتا یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ شریف کو جنابت کی حالت میں پڑھنا جائز نہیں اور اُس کے بعد صورت مکتوبی میں اس کا تنزل ہوا اسی وجہ سے بغیر طہارت کے اُس کو ہاتھ لگانا درست نہیں۔ اسی طرح جس صورت میں اس کا تنزل ہو واجب التعظیم ہے۔ اسی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فونوگراف کی تختیوں میں جو خطوط ہوں جن سے قرآن کی آواز نکلتی ہے تو ان کو بھی بغیر طہارت کے ہاتھ لگانا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ انہی خطوط پر آلے سے آواز نکلنے کا مدار ہے جس سے ظاہر ہے کہ اُن خطوط میں وہ موجود ہے۔

کلام اُس میں تھا کہ عالم عبارت جلوہ گاہ عالم معنی ہے سو اُس کا حال کسی قدر معلوم ہو گیا۔ اب یہ معلوم کرنا چاہیے کہ عبارت میں جار کی ضرورت کیوں ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی اسم فعل یا شبہ فعل سے مربوط نہ ہو تو جار آکر

اس کو مربوط اور متعلق کر دیتا ہے مثلاً صلی زید فی الدار میں اگر فی نہ لایا جائے
اور صلی زید الدار کہیں تو بالکل غیر مربوط ہو جاتا ہے۔ اس لئے
فی لایا گیا تاکہ دار کو کھینچکر صلی کی طرف لے جائے اور جو اُس کو اُس فعل سے
بالکل اجنبیت ہے دور کر کے خاص طور پر اُس سے متعلق کر دے اس عبارت
کو دیکھئے صلی زید یوم الجمعة وقت الظہر سنة فلان قائماً
مع احبابه مع خضوع وخشوع فی الدار۔ باوجودیکہ دار صلی سے
کتنی دور ہے اور ممکن ہے کہ اور قیود وعبارت بڑھا کر اس سے بھی زیادہ
دور کر دیں مگر جار اس کو اس قدر نزدیک کر دیتا ہے کہ جتنے موانع اور حواجب
ہیں اُن میں سے کوئی اس کے تعلق کو قطع نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مرشد کامل جو
جار الی اللہ ہے یعنی خدائے تعالیٰ کی طرف مرید کو کشاں کشاں لے جاتا ہے
اور مرید اُس طرف کھینچ جاتا ہے۔ جس پر لفظ مجرور پورے طور پر صادق آتا ہے
اور مرید کو ایسی قربت حاصل ہوتی ہے کہ درمیانی اسباب و وسائط اُس کی
نظروں سے ساقط ہو جاتے ہیں اور باوجود بُعد کے تعلق قلبی اُس کا ایسا
ہوتا ہے کہ معنیً نزدیک ہو جاتا ہے۔ ضروری اور پہلا کام مرشد کا یہ ہوتا ہے
کہ افعال آلہیہ وصفات آلہیہ سے اُس کو متعلق اور مربوط کر دے تاکہ جملہ
افعال وحرکات وسکنات عالم کو افعال آلہی سمجھے۔ ارشاد ہے وھو الذی
یمسک السموات والارض ان تزولا ولئن زالتا ان

امسکہما من احد من بعدہ خدائے تعالےٰ ہی نے زمین اور
آسمان کو گرنے سے روک رکھا ہے اور اگر وہ گر پڑیں تو خدا کے سوا اُن کو کون
روک سکتا ہے یہ تو سکنات سے متعلق فعل الٰہی ہے اور حرکات کا تعلق اس سے
ظاہر ہے کہ لا تتحرك ذرة الا باذن اللّٰہ مقصود یہ ہے کہ مرید جملہ حرکات
وسکنات کو خدائے تعالےٰ کے افعال یا آثارِ افعال سمجھے۔ جب یہ امر مرید کے
نصب العین ہوا اور اُس کا مشاہدہ ہونے لگے تو دل جمعی ہو جائے گی اور وہ
پریشانی جو ہم لوگوں کو ہوتی ہے کہ فلاں شخص ہمارا دشمن ہے۔ مبادا کہیں ضرر
نہ پہنچادے۔ جس سے بچنے کی تدابیر میں وقت ضائع ہوتا ہے اور اُس میں
خدائے تعالےٰ سے جو بے تعلقی ہوتی ہے اور اقسام کی مصیبتیں اور پریشان
فکریں ہوتی ہیں وہ سب دور ہو جائینگی اور باطمینان خاطر یاد الٰہی میں مشغول ہوگا
اسی طرح دوستوں کو راضی کرنے اور ان کی آؤ بھگت میں باقتضائے بشریت
جو وقت صرف ہوتا ہے اور تعلق قلبی اُن سے منافع حاصل کرنے میں لگا رہتا
ہے جس کی وجہ سے حق تعالےٰ سے بے تعلقی ہو جاتی ہے وہ دفع ہو جاتی
ہے اس وقت نافع وضار وہ حق تعالیٰ ہی کو سمجھتا ہے اگر خوف ہے تو اسی سے
ہے اور امید ہے تو اُسی سے۔ اسی طرح جتنے کام دنیا میں ہوتے ہیں سب کا
دار و مدار اُسی پر اور سب کا خالق اسی کو سمجھتا ہے جس سے یک در گیر محکم گیر
کا مضمون اس پر صادق آجاتا ہے اُسی کو توحید افعالی کہتے ہیں۔

غرضکہ پیر مرید کو کھینچکر توحید کی طرف لے جاتا ہے مگر اس کو اوائل میں بڑی
بڑی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں کیونکہ لڑکپن سے مشاہدہ ہو رہا ہے کہ دوست
نفع پہنچاتا ہے اور دشمن ضرر اور نافع اور ضار چیزیں ممتاز ہیں جن کا ہر وقت
ایک ساں اثر ہوتا ہے۔ مثلاً زہر جو کوئی کھائے اُس کو ضرر ہو گا خواہ کچھ بھی
اعتقاد رکھے اسی طرح پانی سے ضرور تشنگی رفع ہوتی ہے۔ طبیعت اس دوامی
مشاہدہ کی عادی ہو گئی ہے کہ ہر اثر کو اس چیز کی طرف منسوب کرے جس کا
بحسب تجربہ و مشاہدہ اثر ثابت ہوتا ہے۔ اب اس طبعی امر کو چھوڑ کر ہر بات
میں خدا تعالٰے کو موثر سمجھنا کوئی معمولی بات نہیں یوں تو ہر عامی شخص بھی یہی
کہد یتا ہے کہ خدا ہی سب کچھ کرتا ہے اور یہ خدا کے کام ہیں مگر کہنے کہنے
میں فرق ہے ایک کہنا وہ ہے کہ اس کا تعلق صرف زبان سے ہوتا ہے جہاں
دل لگی میں اور باتیں ہوتی ہیں اُن میں ایسی باتیں بھی کہدی جاتی ہیں اور
ایک کہنا یہ ہے کہ اُس کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور یہ اُس وقت ہوتا ہے
کہ ہر فعل میں بے تکلف مشاہدۂ توحید افعالی رہے یہاں تک کہ اُس پر آثار
مرتب ہونے لگیں اور یہ کوئی محال بات نہیں۔ کیونکہ خدائے تعالٰے کسی کی
محنت کو رائیگاں نہیں فرماتا اور ارشاد ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم
سبلنا۔ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور مشقت
اُٹھاتے ہیں ان کو ہم اپنے راستے دکھادیتے ہیں۔

ہر چند آخر میں یہ بات ہوتی ہے مگر وہ طفیل پیر ہی کا ہے جو اس درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ الحاصل پیر جار ہوا اور مرید مجرور اور ان دونوں کا تعلق فعل الٰہی سے ہے اور کبھی جار مجرور کا تعلق صیغۂ صفت سے ہوتا ہے جیسے سمیعٌ بصیرٌ قادرٌ وغیرہ۔ یہ تعلق اس طرح ہوتا ہے کہ تمام عالم میں اسماء حسنیٰ کی سلطنت ہے۔ مثلاً رب کی سلطنت اس طرح ہے کہ کوئی شئے ربوبیت الٰہیہ سے خارج نہیں ہو سکتی کما قال تعالیٰ (رب العالمین) اسی طرح رحمٰن کی عام سلطنت ہے جیسا کہ ارشاد ہے الرحمٰن علی العرش استوی چونکہ عرش تمام عالم پر محیط ہے رحمٰن بھی محیط ہے جہاں کسی کو نفع یا ضرر پہنچے وہاں نافع یا ضار کی سلطنت ہوگی ہدایت اور ضلالت میں ہادی اور مضل کی سلطنت ہوگی جب تک ہادی کی سلطنت کسی پر رہے ممکن نہیں کہ کوئی اس کو گمراہ کر سکے۔

سلطنت اسمائے الٰہی

علیٰ ہذا القیاس جو نافع کی سلطنت میں ہو ممکن نہیں کہ کوئی اس کو ضرر پہنچا سکے۔ جب پیر مرید کو صیغۂ صفت سے متعلق کرتا ہے تو بحسب تقریر بالا اس کا تعلق صفات الٰہیہ سے ہوتا ہے اور توحید صفاتی اس پر منکشف ہوتی ہے اس طور سے کہ جس کسی میں کسی ایسی صفت کا ظہور ہو جو متعلق بذات الٰہی ہے جیسے سمیع بصیر وغیرہ تو اس کو صفت الٰہیہ کا مظہر سمجھتا ہے غرضکہ پیر جار ہے اور مرید مجرور یہ دونوں فعل الٰہی یا صیغہ صفت سے یعنی اسماء الٰہیہ سے

متعلق ہوتے ہیں جس سے توحید افعالی اور توحید صفاتی نصب العین ہوتی ہے اس کے بعد توحید ذاتی ہے مگر بندہ کا اس سے تعلق ہونا مشکل ہے کیونکہ ذات الٰہی کو عالم سے کوئی تعلق نہیں چنانچہ ارشاد ہے ان اللہ غنی عن العالمین اور قطع نظر اس کے اس کا ثبوت یوں ہو سکتا ہے کہ عالم کا ذرہ ذرہ خدائے تعالیٰ کا محتاج ہے مگر اس کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ احتیاج کیسی ہے پہلے پہل ہر چیز خدائے تعالیٰ کی طرف اس وجہ سے محتاج ہے کہ اس کو وجود میں لائے ادنیٰ تامل سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ یہ احتیاج نفس ذات کی طرف نہیں بلکہ خالق کی طرف ہے جو اسم الٰہی ہے جس میں صفت خالقیت معتبر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر شے اپنی بقا میں محتاج ہے سو یہ احتیاج بھی نفس ذات کی طرف نہیں بلکہ حافظ کی طرف ہے جو صیغۂ صفت ہے علیٰ ہذا القیاس کل احتیاجیں صفات یا افعال سے متعلق ہیں۔ اسی وجہ سے جار مجرور کا تعلق فعل سے ہوتا ہے یا شبہ فعل سے یعنی فعل الٰہی سے یا صفت الٰہیہ سے۔

ربّ

(رب) یہ لفظ مضاف ہے اس کا اصل ربب تھا دو حرف ایک جنس کے جمع ہوئے۔ پہلے کو ساکن کر کے دوسرے میں ادغام کیا گیا رب ہوا۔ یعنی پہلا با دوسرے میں چھپ گیا۔ شان ربوبیت خالق کا مقتضیٰ یہی تھا کہ خود

ظاہر

ظاہر نہ ہو۔ اور مربوب یعنی جس کی پرورش مقصود ہے اس کو ظاہر کر دے
دیکھئے جب کسی کو رزق دیا جاتا ہے تو اس کے آثار چہرہ سے نمایاں ہوتے
ہیں۔ اور تمام قوتیں اور جسم گواہی دیتا ہے کہ روزی مل گئی مگر یہ معلوم نہیں
ہوتا کہ کس نے دی۔ یوں تو خدا اور رسول کے ارشاد سے معلوم ہو گیا کہ
رزق دینے والا وہی خدائے تعالےٰ ہے مگر وجدانی طور پر یہ بات معلوم
نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے جب نگاہ پڑتی ہے تو اپنے ہی پر پڑتی ہے
کہ ہم نے اپنے قوت بازو سے رزق حاصل کیا یا کسی غلہ سے حاصل
ہوا یا کسی آدمی نے دے دیا۔ غرضکہ خدائے تعالےٰ نے اپنی ربوبیت
کو اس طرح چھپایا کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو۔ جس طرح لفظ رب میں پہلا
(با) چھپا ہوا ہے اس کی صورت محسوس ہے نہ علامت۔ یہانتک کہ
اس کا نقطہ بھی نظر نہیں آتا اور نمایاں ہے سو وہی ایک دوسرا با ہے
مگر لفظ رب اشارتاً کہہ رہا ہے کہ اگر بائے اول نہ ہوتا تو یہ قوت اور
شدت جو مدغم فیہ میں محسوس ہے وجود ہی میں نہ آتی۔ ہر چند پہلا با بالکل
چھپا ہوا ہے۔ مگر جو عقلا ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ درباطن اسی کی حرکت معنوی
کا ظہور ہے جس طرح تمام عالم کی حرکت اور قوت گواہی دے رہی ہے
کہ بغیر رب العالمین کی ربوبیت کے مجال نہیں کہ کوئی حرکت کر سکے۔
لغت میں رب کے معنی مالک مدبر مربی ولی اور نعمت دینے والے کے

ہیں مثلاً رب المال مالک مال کو کہتے ہیں اور فیسقی ربہ خمراً میں رب کے معنی سردار کے ہیں اور حدیث شریف میں ہے۔
اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ میں رب کے معنی زیادہ کرنے والے اور تمام کرنے والے کے ہیں۔ اور ایک قرارت میں یہ آیۂ شریفہ یوں پڑھی گئی ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی یعنی قیامت کے روز روح کو حکم ہوگا اپنے صاحب یعنی قالب کی طرف رضامندی کے ساتھ رجوع کر اور میرے بندوں میں داخل ہوکر میرے جنت میں چلی جا۔ یہاں رب کے معنی صاحب کے ہیں۔
قبیلۂ ثقیف نے ایک بڑے پتھر کا بت بنا لیا تھا جس کا نام لات ہے اور اس کو الربّہ بھی کہتے تھے اسی طرح نجران میں مدحج اور بنی الحارث نے ایک گھر کعبہ کے مقابلے میں بنایا تھا اس کو وہ دار ربہ کہتے تھے یہاں ربہ کے معنی بڑے اور ضخیم کے ہیں یہ گھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے توڑا گیا۔
اور ربوبیت اور ربابت کے ایک معنی ہیں یعنی پرورش اور ربانی عابد اور عارف باللہ شخص کو کہتے ہیں اور ربابت کے معنی مملکت کے بھی ہیں نسبت کے وقت ربوبی کہتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ علم ربوبی اور جب مبالغہ مقصود ہوتا ہے تو الف و نون زیادہ

کرکے ربانی کہتے ہیں۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ خدائے تعالےٰ رب العالمین ہے یعنی تمام عالموں کا پرورش کرنے والا ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ کل عوالم کتنے ہیں اور ان کے پرورش کے طریقے کیسے ہیں۔ باوجودیکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آفتاب وغیرہ نجوم روزانہ اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔ اور یہ جانتے ہیں کہ جب تک اُن کی پرورش خاص طور پر نہ ہو وہ کام نہیں کرسکتے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ ان کی پرورش کس طریقے سے ہوتی ہے۔ کیونکہ پرورش کے طریقے مختلف ہیں۔ چنانچہ جب ہم اپنے نزدیک کی چیزوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر نوع کی پرورش کا طریقہ ہی جدا پاتے ہیں۔ مثلاً نباتات کی پرورش صرف مٹی اور پانی سے ہے اور حیوانات کی پرورش نباتات اور پانی وغیرہ سے اور انسان کی پرورش کا طریقہ ہی جدا ہے۔ چونکہ انسان کی پرورش کا ذکر اس مقام میں آگیا۔ اس لئے اجمالی طور پر اس کا کچھ ذکر کیا جاتا ہے یہ بات معلوم ہے کہ آدمی کی زندگی کا مدار چار خلطوں پر ہے بلغم۔ خون۔ صفرا۔ سودا۔ ان سب میں خون نہایت لطیف چیز ہے۔ چنانچہ بعضے حکیموں کے نزدیک تو خون ہی آدمی کی جان ہے۔ اور اکثر کا قول ہے۔ کہ خون سے روح حیوانی بنتی ہے۔ بہرحال خون مادہ حیات ہے مگر اس میں کسی قسم کا فساد آجاتا ہے تو وہی سم قاتل بن جاتا ہے۔ عورتوں کی

انسان کے متعلق بیان

طبیعت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ کل خون اُن کا جزو بدن نہیں ہوتا بلکہ ہر مہینے کسی قدر معمول میں خارج ہو جاتا ہے۔ اگر وہ خارج نہ ہو تو اقسام کے امراض پیدا ہوتے ہیں جو باعث ہلاکت ہیں۔ اب دیکھئے کہ یہی خون جس کا دفع ہونا ضروری تھا۔ حمل ہوتے ہی وہ جمع ہونے لگتا ہے اور غالباً بچے کا جسم اسی سے بنتا ہے۔ پھر جب اس میں جان بھرتی ہے تو وہی خون ناف کے ذریعہ سے اس کے جسم میں سرایت کر کے اس کا جزو بدن بنتا ہے اگر یہی خون ماں کے اعضاء میں سرایت کرنے لگے تو نوبت بہلاکت پہنچ جائے۔ اور بچہ باوجودیکہ نہایت نازک اور ضعیف القویٰ ہے مگر اسی مادہ سمی کو نوشجان کر کے اُس زاویۂ تیرہ و تار میں اپنے پروردگار کا شکر جان و دل سے بجا لاتا ہے۔ اگر اس مقام میں اس کے روبرو ہریانی مزعفر رکھا جائے تو ہرگز اس کے طرف رخ نہ کرے گا بلکہ وہ اس کے حق میں سم قاتل ہے جس سے معلوم ہوا کہ بچے کی غذا ماں کے حق میں سم قاتل ہے اور ماں کی غذا بچے کے حق میں سم قاتل ہے۔

ایک مدت معینہ تک کھانا پانی دوا غذا جو کچھ کہئے وہی ایک شئے ہے جو اُس کی ماں کے حق میں زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ چونکہ وہ ایک ایسے مقام میں ہے کہ جہاں نہ نباتات کا وجود ہے نہ حیوانات وغیرہ کا اور نہ وہ اپنے قوت بازو سے کسب معاش کر سکتا ہے اس لئے ربوبیت الٰہی نے اس کے

لئے یہ تدبیر کی کہ بغیر ہاتھ پاؤں اور منہ ہلانے کے ناف کے ذریعہ سے خودبخود اُس کو غذا پہنچتی رہے جس کی نہ اس کو خبر ہے نہ اُس کے ماں باپ کو جب ہمیں یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ ربوبیت کسی خاص طریقہ کی پابند نہیں مقام تنگ و تاریک میں جہاں انسان کا دسترس نہ ہو وہاں روزی فراہم کردے زہر سے غذا کا کام اور ناف سے منہ کا کام لے تو بڑی بے ادبی کی بات ہو گی کہ خدائے تعالیٰ کی قدرت انہیں امور میں منحصر اور محدود کردی جائے جو عادت میں جاری ہیں۔

یہاں ایک لطیف بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس عالم میں تشریف فرما ہوئے تو آپ کا نال کٹا ہوا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کی غذا ایام حمل میں وہ نہ تھی جو ہر فرد بشر کی ہوا کرتی ہے۔ یعنی خون حیض کیونکہ اس کے پہنچانے کا ذریعہ ہی منقطع کر دیا گیا تھا اگرچہ اس مقام میں وہ خون نہ شرعاً نجس ہے نہ عقلاً مگر عالم تخیل میں تو اس سے کراہت ضرور ہوتی ہے اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں یہ بھی گوارا نہیں فرمایا اور وقت ولادت باسعادت یہ بات سب پر منکشف کرادی گئی کہ اُس عالم میں آپ کی غذا بھی کچھ اور تھی پھر اس عالم میں بھی اصلی غذا آپ کی کچھ اور ہی تھی جس کا حال خود اپنی زبان فیض ترجمان سے فرماتے ہیں

کہ اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ فَیُطْعِمُنِیْ وَیُسْقِیْنِیْ یعنی میں رات کو اپنے
اپنے پروردگار کے یہاں رہتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے ظاہر ہین
اس طعام وشراب کی حقیقت کیا جانیں۔ اگر فقط لاعلمی ہو تو مضائقہ نہیں۔
کیونکہ آدمی بہت سارے چیزوں کو نہیں جانتا۔ جس کا سب کو اعتراف ہے
مگر قابل افسوس یہ بات ہے کہ بعض لوگ اپنی لاعلمی کو اس بات پر دلیل
بناتے ہیں۔ کہ اُس کی کچھ اصل ہی نہیں۔ اُن سے یہ پوچھا جائے کہ ہم ہی
تھے کہ ایک سمی مادے کو مدتوں ہضم کرتے رہے۔ اور اب نہیں کر سکتے
ہم میں کون سی چیز کم ہو گئی جس سے اُس کے ہضم کرنے کی قوت باقی نہ رہی
ہمارے اصلی اعضا جو اُس وقت ضعیف تھے اب قوی ہو گئے۔ تمام قوتوں
میں کمال پیدا ہو گیا۔ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ قوت ہاضمہ اچھی طرح
اُس کو ہضم کر سکے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس کی کوئی ایسی وجہ نہ بتلا
سکیں گے جو تشفی بخش ہو۔ پھر جب اس غیر معمولی غذا کو مان گئے تو اور
غیر معمولی غذاؤں کو ماننے میں کیا نقصان ہو گا

الغرض ایک مدت تک ربوبیت کا ظہور اس طرح ہوتا رہا جس کا حال
ابھی بیان کیا گیا۔ اس کے بعد جب ہم اُس نہاں خانہ بطوں سے جلوہ گاہ
ظہور میں برآمد ہوئے تو شان ربوبیت دوسرا رنگ لائی وہی خون جو ہمارے
اُس مسکن میں ابر کی طرح ہمیں سیراب کرتا تھا۔ اب نیچے سے اوپر کی جانب

چڑھایا گیا اور اُن حوضوں میں پہنچا جو مدتوں سے سوکھے پڑے تھے وہاں اُس نے ایسی صورت بدلی کہ پہلی صورت کا نام و نشاں تک باقی نہ رہا اُس کا قوام نہایت لطیف اور رنگ نہایت براق ذائقہ نہایت شیریں اور نہایت خوشگوار ہو گیا۔ اور اُن حوضوں میں فوارے لگا دئے گئے یہ سامان ربوبیت ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہی کر دیا گیا۔ مگر اب وہ عالم کہاں جس میں بغیر مانگے اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلانے کے رزق خود ہمارے پاس آتا بلکہ خود بخود ہمارے جسم میں چلا جاتا تھا۔ اب تو ہوا ہی پلٹ گئی اور بغیر کوشش کئے اُس کا ہم تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔ دیکھا کہ وہ نہ ہم تک آتا ہے نہ ہم اُس تک جا سکتے ہیں۔ اپنی بے بسی پر بے اختیار رو دیا ؎ لمؤلفہ۔

زمانے تک رہا و نا عدم کے چھوٹ جانے پر
فزوں ہوتا گیا پھر رنج و غم آہستہ آہستہ

اُدھر شان ربوبیت نے ماں میں شفقت پیدا کر دی کیسی حالت میں ہو رونے کی آواز پر اُس کے کان لگے ہوئے ہیں جہاں بچہ رویا بے قرار ہو کر خوان نعمت لے کر دوڑی۔ اب زحمت ہے تو اس قدر ہے کہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دے کر اپنی غذا حاصل کریں۔

یہ طریقہ اُس زمانے تک رہا کہ ثقیل غذا کو بذریعہ آلات یعنی دانت سے

پیس کر کھائیں ۔ اس کے بعد جب دانت دیئے گئے تو اب ربوبیت کا طریقہ دوسرا مقرر کیا گیا ۔ اور ہر قسم کی ثقیل اور کثیف غذائیں کھانے لگے ۔ یہ تو ایک عام بات تھی اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو ہر عضو کی ربوبیت اور پرورش کا طریقہ ہی علیحدہ ہے ۔

دیکھئے اس ایک غذا سے جو کھائی جاتی ہے مختلف مقاموں میں مختلف چیزیں پیدا ہوتی ہیں ۔ سب میں نہایت نرم گوشت ہڈی نہایت سخت مثل پتھر کے پٹھے ایسے مضبوط کہ جن کا ٹوٹنا مشکل جس عضو کی طبیعت دیکھئے جدا کوئی نہایت گرم ہے تو کوئی نہایت سرد ۔ کسی کا رنگ سرخ ۔ کسی کا سفید و سیاہ وغیرہ ۔ غرضکہ اس چھوٹے سے جسم میں اتنے کارخانے قائم ہوئے جو تمام عالم میں ہیں اور ہر ایک کا رزق اسی ایک غذا سے حاصل ہوتا ہے اور سب اپنا اپنا رزق حاصل کر کے رب العالمین کی شکر گذاری میں مشغول رہتے ہیں ۔ جس طرح ہمیں خبر نہیں ہوتی کہ ہر ایک کا رزق کس طرح پہنچا ان کا شکر کرنے کا حال بھی ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا ۔ ان کے رزق پہنچانے میں اگر ہمارے فعل کو دخل ہے تو اس قدر کہ ہم اس کو اپنی قوت سے حلق کے نیچے اتار دیتے ہیں ۔ پھر نہیں معلوم کہ اس اندھیری کوٹھری میں کیا کیا ہوتا ہے ۔ دراصل حلق سے نیچے پہنچانا بھی ہمارے اختیار میں نہیں وہ بھی ربوبیت ہی سے متعلق ہے ۔ دیکھئے اگر ایک پٹھے میں بھی فرق آ جائے تو

منہ کا

منہ کا کھلنا دشوار ہے۔ غرضکہ ربوبیت الٰہی کے کرشمے بے حد و بے حساب ہیں عالم تو ایک بڑی چیز ہے صرف ہم اپنے آپ ہی کو دیکھیں تو عمر تمام ہوجائے اور اُس کا علم ہنوز ناتمام رہے۔

آدمی کا ذاتی مقتضے ہے کہ جس شخص سے اپنی پرورش متعلق ہوتی ہے اس کا نہایت ممنون احسان ہوکر سرگرمی سے اُس کی خدمت و اطاعت میں مشغول ہوتا ہے۔ دیکھئے ایک مہینے کے بعد جو شخص ماہوار دیتا ہے اُس کی خدمت و اطاعت روزانہ ایک مہینے تک کرنی مشکل نہیں ہوتی۔ ذاتی کاروبار چھوڑکر آدمی خوشی سے اُس کے کاروبار میں مشغول ہوتا ہے اور اُس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم اُس پر کوئی احسان کر رہے ہیں۔ بلکہ اُسی کا احسان مانتے ہیں جس نے نوکر رکھا چنانچہ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

پھر اگر غور سے دیکھا جائے تو نوکری وغیرہ ملنی بھی ربوبیت ہی کا اثر ہے اس لئے کہ ابھی معلوم ہوا کہ ربوبیت ہر وقت باقتضائے حال بدلتی گئی جب وہ زمانہ آگیا کہ اپنی قوت بازو پر گھمنڈ اور لوگوں کے دینے لینے پر بھروسہ ہے تو اُس وقت کا اقتضا یہی تھا کہ خواہ اطاعت کرو یا نہ کرو اور خالقیت کا اعتراف کرو یا نہ کرو ربوبیت اور پرورشی میں فرق نہیں آسکتا۔ کیونکہ

جس مدت تک اس عالم میں رکھنا ہے اُس وقت تک روزی دینے کی ضرورت ہے
جس طرح سلاطین قیدیوں کو بھی روٹی دیتے ہیں۔ گو کیسا ہی سخت مجرم اور باغی ہو
ہاں اتنا فرق ہے کہ سلاطین نے دارالجزا ر قید خانہ کو بنایا ہے۔ اس لئے وہ
روزی دینے میں بھی سزا کا لحاظ رکھتے ہیں۔ بعضے کم مقدار اور ادنیٰ درجہ کی غذا
دیتے ہیں۔ اور حق تعالے نے چونکہ دارالمکافات اور جزا اور سزا دوسرے
عالم میں رکھا ہے اس لئے ان کی روزی پر یہاں کچھ اثر نہیں ڈالا گیا بلکہ مجرموں کو
بے جرموں سے زیادہ اور عمدہ غذائیں اور آسائشیں یہاں دی جاتی
ہیں کیونکہ اس کی رحمت گوارا نہیں کرسکتی کہ ایک جرم کی سزا اس عالم میں بھی ہو
اور اُس عالم میں بھی۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے الدنیا جنۃ
الکافرین اور حق تعالے فرماتا ہے نملی لھم ان کیدی متین
یعنی ہم ان کو مہلت دیتے ہیں چونکہ لوگوں کی عقلوں پر پردے پڑے ہوئے
ہیں اس لئے ان کی نظر اس پر پڑتی ہی نہیں کہ جب سے ہم ماں کے رحم میں آئے
ابتک ہر آن وہر لحظہ کیسی کیسی پرورشیاں ہوئیں اسی وجہ سے رزاق حقیقی
سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور اسی کو آقا اور رزاق سمجھتے ہیں جو کوئی کچھ
دیدیتا ہے۔ بخلاف ان کے جن کی عقلیں سلیم ہوتی ہیں ان کی نظر ہر ایک
موقع کی ربوبیت پر پڑتی ہے اور سمجھ جاتے ہیں کہ اس موقع میں بھی ربوبیت
کا ظہور خاص طور پر ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ تمام وسائط میں ربوبیت الٰہی کو

مرتبز

مدنظر رکھتے ہیں ہر وقت شکر آلہی بجالاتے ہیں اور چونکہ ان وسائط کی شکر گزاری کا بھی حکم ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرماتے ہیں من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ یعنی لوگوں کی شکر گذاری بھی ضروری ہے اس لئے محض امتثال امر کے لحاظ سے اپنے محسن کے بھی شکر گذار رہتے ہیں۔ اور حق تعالےٰ فرماتا ہے وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا یعنی اے میرے رب جس طرح میرے ماں باپ نے مجھے پرورش کی تو اُن پر رحم کر۔ دیکھئے اس آیہ شریفہ میں تعلیم ہے کہ ماں باپ کی ربوبیت بھی مانی جائے اور خالق کی ربوبیت بھی۔ کیونکہ لفظ ربیانی سے ان کی ربوبیت اور ربی سے خالق کی ربوبیت ثابت ہے کیونکہ اصل ربوبیت خالق عزوجل کی ہے۔ اس لئے اس کی شکر گذاری اور عبادت فرض ہے۔ حق تعالےٰ فرماتا ہے ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون اولٰئک اصحاب الجنۃ خالدین فیھا جزاءً بما کانوا یعملون۔ یعنی جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پہ استقامت کی تو نہ اُن کو کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے وہی لوگ جنت والے ہیں جو ہمیشہ اس میں رہینگے یہ نتیجہ اُن اعمال کا ہے جو وہ کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ صرف خدا کو رب کہدینا کافی نہیں بلکہ اس پر استقامت بھی ضرور ہے اور جب تک وہ مشاہدہ اور ایسے اعمال صادر نہ ہوں جو شکر گذاری پہ دلیل ہیں استقامت

صادق نہیں آسکتی۔ اسی وجہ سے اس آیۂ شریفہ میں جنت جزائے اعمال قرار دی
گئی ہے جو شکر گذاری پر دال ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے ان الذین
قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملٰئکۃ
ان لا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون
نحن اولیٰؤکم فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ ولکم فیھا
ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون نزلاً من غفور
رحیم۔ یعنی جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم
رہے ان پر فرشتے نازل ہوں گے اور یہ کہیں گے کہ اب نہ تم ڈرو اور
نہ غمگین ہو اور خوش ہو جاؤ اس جنت سے جس کا تم وعدہ دئے جاتے تھے
ہم تمہارے دوست ہیں دنیا اور آخرۃ میں اب اس میں تمہارے لئے وہ
چیزیں ہیں جن کی خواہش تمہارے نفس کریں اور اس میں تمہارے لئے
مہمانی ہے بخشنے والے اور رحم کرنے والے کی جانب سے۔

ان آیات شریفہ میں اُن لوگوں کے مدارج بیان کئے گئے جو ربنا اللہ کہکر
اس پر استقامت کرتے ہیں۔ دیکھئے کس درجہ کا تقرب حاصل ہے کہ قیامت
میں جب غضب الٰہی جوش میں ہوگا اور ہر طرف سے نفسی نفسی کی صدائیں
بلند ہونگی۔ ان حضرات کے پاس فرشتے آئیں گے اور کہیں گے کہ تمہیں
آج کچھ خوف نہیں اور ہرگز غمگین نہ ہو تمہاری سب خواہشیں پوری ہونگی اور

خدا کے یہاں ہوں گے۔

یوں تو اللہ تعالےٰ کو رب کہنے والے سب مسلمان بلکہ کفار بھی ہیں۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی مسلمان کو قیامت میں کچھ غم اور خوف نہ ہو گا ہرگز نہیں کیونکہ اس روز خوف وغم ہونا نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے صرف اہل استقامت کے حق میں لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون وارد ہے۔ کہ ایسے خوف وغم کے روز وہ بے خوف وبے غم رہینگے جب خوف وغم نہ ہونا اولیاء اللہ کا خاصہ ٹھیرا اور ربنا اللہ کہکر استقامت کرنے والوں کو بھی خوف وغم نہ ہو گا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرات اولیاء اللہ ہی ہیں اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ ان کا ربنا اللہ کہنا معمولی طور پر نہیں بلکہ ان کو مشاہدۂ ربوبیت ہمیشہ رہتا ہے۔ پھر ان میں دو فریق ہیں ایک وہ کہ وسائط کی ربوبیت میں خالق کی ربوبیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور ایک وہ کہ خالق ہی کی ربوبیت ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ اور وسائط ان کے نظروں سے بالکل ساقط ہو جاتے ہیں اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئیے کہ کسی میدان میں شمع رکھی ہو اور صبح صادق طلوع کرے تو ابتدا میں تو شمع کی روشنی نمایاں رہے گی مگر جوں جوں صبح کی روشنی بڑہتی جائے گی شمع کی روشنی دھیمی ہوتی جائے گی یہاں تک کہ جب آفتاب طلوع ہو جائے اس وقت شمع کی روشنی بالکل محسوس نہ ہو گی۔ اسی طرح جوں جوں ربوبیت الہیہ کا

مشاہدہ بڑھتا جاتا ہے وسائط کی ربوبیت مضمحل ہوتی جاتی ہے اور جب وہ مشاہدہ کمال درجہ کو پہنچ جائے تو کسی کی ربوبیت کا خیال بھی نہ آئے گا اور جس طرح روز میثاق الست بربکم کے جواب میں خالص ربوبیت الٰہیہ کا مشاہدہ تھا۔ ان حضرات کو ہر وقت وہی مشاہدہ رہتا ہے پھر ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہونگے بعضے سمجھتے ہونگے کہ گو ربوبیت کے وسائط مضمحل ہیں مگر فی الواقع موجود ہیں اور بعضوں کا یہ خیال ہوگا کہ ربوبیت کے وسائط برائے نام ہیں جیسے ہاتھ سے کسی کو مارتے ہیں تو مار ہاتھ کی طرف منسوب کی جاتی ہے حالانکہ مارنے والا دراصل نفس ناطقہ ہے بہرحال ربنا اللّٰہ کہنے والی ایک جماعت مسلمانوں میں ایسی ہونی چاہیئے کہ عملاً یہ ثابت کر دکھائے کہ ان کے نزدیک اللہ کے سوائے کوئی پرورش کرنے والا ہی نہیں۔ چنانچہ بزرگان دین کے اقوال و احوال سے ظاہر ہے کہ نہ انہوں نے کسی سے کچھ مانگا نہ اور کوئی تدبیر کی بلکہ توکل پر ان کی گذران رہی یہ ان کا ذاتی خیال نہیں۔ بلکہ تعلیم الٰہی بھی اسی قسم کی انہیں ہوی کیونکہ مدار مدارج عالیہ کا ربنا اللّٰہ کہنے پر رکھا گیا ہے۔ اہل مذاق جانتے ہیں کہ ربنا اللّٰہ سے توحید ربوبیت مقصود ہے ورنہ اللّٰہ ربنا ہوتا اسی وجہ سے رب النّاس ارشاد ہوا جس سے ظاہر ہے کہ کل آدمیوں کی پرورش اسی سے متعلق ہے۔

الفقیر الاحقر (ختم)

الف لام

(اَلِ) (الف) وہ حرف ہے جس کو عالم حروف یعنی حروف تہجی میں صدارت حاصل ہے۔ جتنے حروف ہیں سوائے ہمزہ کے سب کے نام کی ابتدا میں تلفظ اسی حرف کا ہوتا ہے جس کا نام ہے جیسے لام کہ اُس کے شروع میں لام ہے۔ بخلاف الف کے کہ اس کے نام کی ابتدا میں الف نہیں بلکہ ہمزہ ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ جس طرح تمام عالم حروف میں اسم ذات مسمّیٰ پر دلیل ہے الف میں وہ بات نہیں جیسے اسم الٰہی ذات الٰہی پر دلیل نہیں ہے۔ اگر لفظ اللہ عجم میں ناواقفوں کے روبرو کہا جائے تو کسی کا خیال اُس کے مسمّیٰ کی طرف منتقل نہ ہوگا۔ چونکہ ہمزہ نے الف کے نام سے خاص تعلق پیدا کیا اس وجہ سے اس میں بھی خاصیت پیدا ہوگئی کہ ہمزہ کا نام بھی اپنے مسمّیٰ پر دلیل نہیں۔ ذات الف جب نہاں خانۂ بطون سے دارالسلطنت عالم حروف یعنی دہن میں جلوہ گر ہوتا ہے تو زبان۔ لب۔ حلق۔ جن کو مخارج سے حروف کے نکالنے میں دخل ہے وہ کل مخارج حروف سے بے تعلق اور علٰحدہ ہو جاتے ہیں تاکہ کہیں کوئی حرف نکل نہ پڑے۔ غرضکہ جس وقت الف برآمد ہوتا ہے کل اعیان ثابتہ حروف کے زاویۂ خمول میں رہتے ہیں

اور الف اُن سب کے مقامات پر مسلط ہوتا ہے۔ اُس وقت جدھر دیکھئے
الف ہی الف ہے۔ اہل اعتبار سمجھ سکتے ہیں کہ الف کو جو اس قدر
تسلط حاصل ہے وہ بدولت سکون ہے۔ اسی وجہ سے جو خاص بندگان الٰہی
ہیں وہ اپنے خالق کے روبرو ایسے بے حس و حرکت ہوتے ہیں کہ کسی بات
میں دم نہیں مارتے نہ ان کو اپنے نفع سے غرض ہوتی ہے نہ نقصان
سے کام وہ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے میت غسّال کے ہاتھ میں۔
حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کن
کالمیت فی ید الغسال جب سکون ان کا اس حد تک پہنچ جاتا ہے
تو ان کو عالم میں تصرف دیا جاتا ہے۔

الف مکتوبی کو باوجود اس کے کہ عالم حروف میں صدارت حاصل ہے
مگر اس کو کسی کے ساتھ پیوستگی نہیں۔ دیکھئے وہ کسی کے ساتھ نہیں ملتا۔
یہ بات اور ہے کہ کوئی اوپر سے آکر اس کے ساتھ مل جائے۔ مگر وہ اپنی طرف
سے کسی سے نہ ملیگا۔ یہی حالت اہل تجرد کی ہوتی ہے کہ اُن کو اپنی ذات
سے کسی کے ساتھ دل بستگی نہیں ہوتی۔ اگر بامر الٰہی کسی کو اُن کے ساتھ تعلق
ہو جائے تو وہ اُس کو گوارا کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ للّٰہی تعلق اور محبت
اہل اللہ کے ساتھ ان کو ہوتی ہے۔

اہل تجرد کو الف کے ساتھ نہایت خصوصیت ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ نے

فرمایا ہے ؎

نیست بر لوح دلم جز الفِ قامت یار
چہ کنم حرف دگر یاد نداد استادم

الف مکتوبی کو ایک اور خصوصیت اور فضیلت حاصل ہے کہ جس طرح عالم حروف میں اس کو صدارت حاصل ہے۔ عالم اعداد میں بھی اسی کو صدارت حاصل ہے۔ اس کا مدلول جو ایک ہے ہر چند عالم اعداد کی ابتدا اُسی سے ہے۔ مگر سلسلۂ اعداد میں وہ شریک نہیں۔ کیونکہ عدد بنانا اس کا کام ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز بنائی جائے بنانے والا اُس سے خارج ہوگا۔

دیکھئے ایک جب تک اپنی وحدت ذاتی پر ہے اُس میں کسی قسم کا تعدد نہیں پھر جب اُس ایک کے ساتھ دوسرا ایک ملا دو ہوئے۔ اس دو کو بنانے والا وہی ایک ہے جو ایک پر زیادہ ہونے سے دو بن گئے۔ پھر دو پر وہی ایک زیادہ ہوا تین ہو گئے۔ اس تین کو بھی اُسی ایک نے بنایا۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہر عدد کے وجود میں ایک کو دخل ہے۔ کیونکہ اگر ایک اس سے ہٹ جائے تو وہ فنا ہو جائے گا۔ یہ امر مسلم ہے کہ عالم اعداد ایک ایسا عالم ہے کہ اس کی انتہا ہی نہیں۔ کیونکہ عدد کا سلسلہ غیر متناہی ہے۔ اور ہر ایک عدد اپنے تشخص و ذات میں مستقل اور دوسرے سے ممتاز ہے۔ اگر کوئی چار کو پانچ

سے کہے تو دیوانہ سمجھا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ عالم اعداد میں غیر متناہی اشخاص ہیں اور وہ ایک (۱) سب کے ساتھ ہے۔ مگر کسی کا عین نہیں۔ بلکہ سب کو وجود دینے والا ہے۔ اب اُس ایک (۱) کے تجرد کو دیکھئے کہ با وجود سب کے ساتھ ہونے کے کوئی عدد یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک (۱) میں ہوں۔ پھر لطف خاص یہ ہے کہ جدھر دیکھئے ایک ہی ایک ہے۔ اور اسی کا ظہور ہے۔

دو عددوں کو جو آپس میں ضرب دیا جاتا ہے جس سے کثرت پیدا ہوتی ہے اس میں بھی یہی راز ہے کہ ایک جتنے منازل و مراتب طے کرتا ہے ان کا مجموع حاصل ضرب ہوتا ہے مثلاً ۴ کو ۵ میں ضرب دیں تو ۴ مضروب اور ۵ مضروب فیہ ہونگے۔ اگر اصلی شکل پر لکھیں تو یوں لکھے جائیں گے (۱۱۱۱ × ۱۱۱۱۱) اور اُن کے ضرب دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن چاروں میں سے ایک ایک (۱) کو ان پانچوں پر لگائینگے۔ اس طرح کہ پہلا ایک (۱) اُن پانچوں پر لگایا جائے گا تو ۵ حاصل ہوں گے جو اس کے ہر ایک (۱) کے ساتھ متعلق ہونے کی گنتی ہے۔ اسی طرح جب دوسرا لگایا جائے گا تو اور ۵ حاصل ہوں گے۔ یہاں تک کہ چاروں کو لگانے سے ۵ کے چار مجموعہ حاصل ہوں گے۔ جو ۲۰ بیس ہوتے ہیں۔ ہر چند ظاہرا چاروں میں سے ہر ایک پانچ کے مجموعہ میں چلا اور پانچ منازل طے کرکے

مگر جب غور سے دیکھا جائے تو چاروں میں ہر ایک کی حقیقت ایک ہی ہے اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک (۱) نے بیس (۲۰) منازل طے کئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار جو ایک مرتبۂ عددی ہے بحیثیت مجموعی مضروب نہیں بلکہ مضروب اُس میں سے ایک ہی ایک (۱) ہے۔ کیونکہ ضرب کرنے سے مقصود یہ نہیں ہے کہ چار کو پانچ پر ماریں تو وہ ٹوٹ کر ان کے بیس ٹکڑے ہو نگے۔ بلکہ مثال مذکور میں ۴ × ۵ چار کی ہر ایک اکائی کو پانچ کی ہر ایک اکائی کے ساتھ ملایا جائے یعنی ضرب دیا جائے تو ہر اکائی کے ضرب میں کچھ بھی نہ بڑھا کیونکہ ایک کو ایک میں ضرب دینے سے ایک ہی حاصل ہوتا ہے۔ مگر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پانچ اکائیاں حاصل ہوئیں۔ علی ہذا القیاس چار بار ضرب دینے سے بیس (۲۰) اکائیاں حاصل ہوں گی۔ اور بیس کی ہیئت مجموعی پیدا ہوگی۔ اب غور کیجئے کہ عالم عدد میں کثرت کو دیکھئے تو کچھ انتہا ہی نہیں اور وحدت کو دیکھئے تو ہر طرف ایک ہی ایک (۱) ہے۔ کہیں اس کے ذاتی تشخص میں فرق نہیں۔ جو لوگ بالغ النظر ہیں ان کی نظر عالم میں بھی اُسی ایک پر جا پڑتی ہے جو تمام عالم اور ہر شئے کو بنانے والا ہے۔ اُسی کی بدولت ان کو تقرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو جب ہمیشہ ان کو کثرت عالم میں خیال اُسی ذات وحدہ لا شریک لہ کا ہو تو اس سے زیادہ اور کیا تقرب ہو سکتا ہے وہ ہر چیز کو دیکھتے ہیں مگر التفات اور توجہ

اُن کی صرف اُسی ذات پاک کی طرف ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس مثال سے واضح ہے۔ کوئی عمدہ کسی فن کی خوشخط کتاب کسی مجلس میں پیش ہو جہاں عالم خوشنویس تاجر وغیرہ موجود ہوں اُس کو سب دیکھیں گے۔ مگر ہر ایک کی نظر جدا ہوگی۔ مثلاً عالم ماہر فن کی نظر اُس کتاب کے مضمون کی طرف ہوگی اور خوشنویس کی نظر خط پر۔ اور تاجر کی نظر قیمت پر۔ حالانکہ ایک ہی چیز کو متعدد لوگ دیکھ رہے ہیں مگر ہر ایک کی نظر جس امر پر ہے دوسرا اس سے غافل ہے اگر ماہر فن سے پوچھا جائے کہ اس کے خط میں کوئی سقم تھا یا اعلیٰ درجے کا با قاعدہ تھا تو کچھ بتا نہ سکیگا۔ اسی طرح خوشنویس سے پوچھا جائے کہ اس کتاب کا کیا مضمون تھا تو کچھ نہ بتا سکیگا۔ اسی طرح اہل اللہ کی نظر ہر چیز میں علیٰ حسب مراتب خدائے تعالےٰ کی صنعت اور صفات وغیرہ پر پڑتی ہے۔ جس سے وہ ہمیشہ مشاہدہ صفات الٰہی میں مستغرق رہتے ہیں۔

الحاصل اعداد کے سلسلے میں ہر ایک درجہ عدد کا ممتاز ہے مثلاً دو بہ نسبت تین کے ممتاز ہے کوئی دو کو تین نہیں کہہ سکتا۔ اور لوازم بھی ہر ایک درجے کے جدا گانہ ہیں۔ مثلاً دو زوج ہے اور تین فرد ہے۔ اور مربع دو کا چار ہوگا اور تین کا نو ہوگا۔ اسی طرح جذر و مجذور وغیرہ میں بحسب تعین خاص امتیاز ہوگا جس سے ظاہر ہے کہ کوئی عدد دوسرے کا عین نہیں۔ باوجودیکہ ہر مرتبہ میں ظہور اسی ایک کا ہے گویا جتنے مراتب ہیں

الٰہی

اسی ایک کے تعینات خاصہ ہیں جیسے وجود مطلق ایک ہے اور وجودات خاصہ
جو مطلق کے تعینات ہیں۔ اگر خاص خاص تعینات سے قطع نظر کر لیا جائے
تو وہی وجود مطلق رہ جائے گا۔ کیونکہ مقید مطلق کا مظہر ہوتا ہے اور مقید
کی ایک عین ثابت ہوتی ہے جس کو وجود نہیں کہہ سکتے اسی طرح ہر عدد
کی ایک عین ثابتہ بھی ہوگی۔ جس کو عدد نہیں کہہ سکتے۔ بالغ النظر ۲ کو
دو اکائیاں سمجھیگا۔ اور ہر ایک معدود کو مستقل ایک (۱) کہے گا۔ اور یہ خیال
نہ کرے گا کہ دو مستقل ایک عدد ہے تو ہر ایک (۱) ایک کا آدھا ہے بلکہ
یہ خیال کرے گا کہ محسوس ایک (۱) ایک (۱) ہے اور اس کو دو (۲) کہنا اعتباری ہے
علیٰ ہذا القیاس کل مراتب اعداد کا یہی حال سمجھا جائے۔ اب دیکھئے غیر متناہی
سلسلہ میں جدھر دیکھئے حقیقۃً ایک (۱) ہی ایک ہے اور جتنے اعداد ہیں سب اعتباری
ہیں۔ الف کو عالم حروف میں جو صدارت ہے وہاں وہ کسی سے نہیں ملتا کیونکہ
وہ عالم اشکال ہے اور عالم اعداد میں بھی صدارت اسی کو ہے۔ مگر سب کے
ساتھ اُسے الفت ہے کیونکہ وہ کل اعداد کا بنانے والا ہے اور ظاہر ہے
کہ بنانے والے کو اپنے مصنوعات سے الفت ہوا کرتی ہے۔ دیکھئے عالم
کی ہر چیز خواہ اچھی ہو یا بُری اُس کے ساتھ جب تک مشیت۔ ارادہ
اور قدرت متعلق نہ ہو وجود میں نہیں آسکتی۔ اس درجہ میں کسی چیز کو
بُری نہیں کہہ سکتے کیونکہ جس طرح صفات موصوفہ اچھی چیز کے ساتھ متعلق

ہوتے ہیں بُری کے ساتھ بھی متعلق ہوتے ہیں۔ احسن کل شئ خلقہ ثم ھدیٰ۔ آنحاصل نفس تخلیق میں بُرائی کا کوئی شائبہ نہیں بلکہ حسن و قبح اضافی امور ہیں۔ ایک ہی چیز کسی کے حق میں اچھی ہوتی ہے اور کسی کے حق میں بُری۔

اہل تناسخ جو کہتے ہیں کہ آدمی اچھے کام کرے تو اُس کی روح برہمن اور گائی کے جسم میں جائے گی اور بُرے کام کرے تو بُرے جانوروں کے جسد میں یہاں یہ دیکھنا چاہیے کہ اچھا یا بُرا کس اعتبار سے کہا جائے اگر کتّے کو بُرا کہیں تو وہ ہمارے حق میں بُرا ہے دو کتے اُس کو بُرا نہیں سمجھتے۔ علی ہذا القیاس جس جانور کو دیکھیے وہ اپنی حالت میں مست ہے کبھی اس کو خیال بھی نہ آتا ہوگا کہ میں آدمی یا دوسرا جانور ہو جاؤں۔ دیکھئے جانور آدمی کے نزدیک آنا بھی گوارا نہیں کرتے جب تک ان کی خوشامد نہ کی جائے۔ اور ان کے تمام حوائج پورے نہ کئے جائیں۔ پھر برہمن جو بموجب اصولِ تناسخ ترقی یافتہ جانور ہیں ان کو خبر بھی نہیں کہ ہم کس قسم کے جانور تھے۔

بہت سے برہمن اپنے سے کم درجہ لوگوں کے پاس بکائے باورچیوں کے نوکر ہوتے ہیں اور افلاس میں رہتے ہیں وہ اپنے دل میں ضرور سمجھتے ہوں گے کہ ایسی ترقی سے تو جانور ہی رہنا بھلا تھا نہ نوکری کی فکر ہوتی نہ جورو، بچوں کو پالنے کی مصیبت۔ اس سے ظاہر ہے کہ حکما نے تناسخ کی بنیاد جس غرض سے ڈالی تھی کہ لوگ بُرے کاموں سے احتراز کریں۔ اس خیال سے کہ اگر

بُرے کام کریں گے تو بُرے جنم لیں گے وہ اس قابل نہیں کہ کوئی عقلمند اس کا قائل ہو سکے۔ غرضکہ موجود ہونے کے اعتبار سے کوئی چیز بری نہیں ہو سکتی کیونکہ شر محض عدم ہے۔ اور نفس وجود خیر محض ہے۔ البتہ صفات و حالات کے اعتبار سے بُرائی آتی ہے مگر وہ بھی عام نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض کی نسبت وہ چیز بُری ہوتی ہے اور بعض کی نسبت اچھی مثلاً نجاست انسان کے حق میں بُری ہے اور اسی کو گائی وغیرہ اس رغبت سے کھاتے ہیں کہ جیسے انسان حلوائے بے دودھ کو کھاتا ہے۔ ایک ہی چیز کسی کے حق میں زہر ہے۔ اور کسی کے حق میں تریاق۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی موجود چیز شر محض اور ہر طرح سے بُری نہیں ہو سکتی۔ ورنہ خالق عزوجل اُسے پیدا ہی نہ فرماتا۔ غرضکہ ایک جو اعداد بنانے والا ہے جس طرح اُس کو کل اعداد کے ساتھ الفت و معیت ہے اسی طرح خالق عالم کو اپنے مصنوعات کے ساتھ بحیثیت خالقیت محبت اور تعلق خاص اور معیت ہے۔ اسی وجہ سے ربوبیت الٰہی عام ہے خواہ مومن ہو یا کافر سب کو رزق دیتا ہے۔ سابق میں معلوم ہوا کہ الف بالذات تمام عالم حروف پر محیط ہے اور اُس عالم کا کوئی فرد ایسا نہیں جس کو اس اعتبار سے تعلق خاص اس کے ساتھ نہ ہو مگر اس میں لام کو جو خصوصیت ہے وہ کسی کو نہیں کیونکہ اس کے دل میں الف ہے جس طرح الف کے دل میں لام ہے۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے جب الف و لام

ملتے ہیں تو اقسام کے لطائف و ظرائف پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً (لا) میں
لام باوجودیکہ مقدم ہے۔ مگر کتابت میں الف ہی مقدم ہے۔ اس کی وجہ بجز
اس کے اور کیا ہو کہ گویا لام نے کمال محبت سے الف کی عظمت کو پیش نظر
رکھ کر اپنی صدارت اس کو دیدی یہ مقتضٰے ولی محبت کا ہے۔ بخلاف اس کے
آج کل دیکھا جاتا ہے کہ دوستوں میں کیسی ہی خصوصیت باہمی ہو مگر جہاں تک
کوئی بات خلاف مرضی ہوئی کہ لام کاف بکنے لگے۔ الف لام کی
اس ترکیب سے گویا ایک مقراض تیار ہوئی جس سے اہل ایمان ماسوی اللہ
کے تعلقات کو قطع کر دیتے ہیں اور لا الٰہ الا اللہ میں ایسے مستغرق
ہو جاتے ہیں کہ ماسوی اللہ کی بالکل نفی ہو جاتی ہے۔ لمولفہ۔

اگر خواہی پیوند با کبریا

بمقراض لا قطع کن ماسوی

الف لام کے ساتھ جب ملتا ہے تو ان دونوں کے ملنے سے عجیب
عجیب حالات پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی تو اسم جنس پر داخل ہو کر اس کو
یک معین شخص بنا دیتے ہیں کبھی افراد و اشخاص سے کوئی تعلق نہیں
صرف جنس یا ماہیت کے معنی میں اس کو خاص کر دیتے ہیں۔ اور کبھی
تمام افراد کے معنی اس میں پیدا کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ علم معانی میں مصرح
ہے۔ یہ قوت تصرف ان کی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ جب دو شخصوں میں

اتحاد قلبی ہے تو وہ بہت کچھ تصرفات کرسکتے ہیں ؎

دو دل یک شود بشکند کوہ را

پراگندگی آرد انبوہ را

دیکھئے مسلمانوں کی جب تک یہ حالت تھی کہ ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ قلبی محبت تھی اُن کا بڑھتا قدم کبھی پیچھے نہ ہٹا اور جب سے یہ صفت جاتی رہی ہٹتا قدم آگے نہ بڑھا۔

غرض کہ الف لام کے اتحاد قلبی سے اگر کوئی سبق حاصل کرے تو فلاح دارین حاصل کرسکتا ہے۔ لام کو الف کے ساتھ جو اتحاد قلبی ہے اُس کا یہ اثر ہوا کہ باوجودیکہ حروف تہجی میں لام الف سے بہت دور واقع ہے۔ لیکن اُس کی محبت قلبی نے الف کے ساتھ اُس کو ملا دیا اور ان دونوں سے وہ کارنمایاں وقوع میں آئے کہ تمام حروف تہجی اگر ملیں تو بھی اس قسم کا ایک کام نہیں کرسکتے۔ اسی پر قیاس کیجئے کہ جس بندہ کے دل میں خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت قلبی ہو اور ہمیشہ ان کا خیال ان سے وابستہ رہے تو اُس کے فیوض و برکات اعلیٰ درجے کے ہوں گے۔ اسی وجہ سے جب بندہ ترقی کرتا ہے تو حق تعالیٰ اُس سے وہ کام لیتا ہے جو خاصۂ جناب کبریا ہے یعنی خوارق وعادات اُس سے صادر ہونے لگتے ہیں۔

ناس

(ناس) جمع ہے۔ اور اس کا واحد انسان ہے۔ انسان کی اصل انسیانٌ بروزن افعلانٌ تھی۔ اور بعض کے نزدیک فعلیانٌ ہے۔ چونکہ اصل میں (یا) تھی۔ اسی وجہ سے انسان کی تصغیر بالاتفاق اُنیسیانٌ ہے۔

عرب اسم کی تصغیر کیا کرتے ہیں جس کے معنی چھوٹے کے ہوتے ہیں مثلاً رجل کی تصغیر رجیل ہے۔ جس کے معنی چھوٹے مرد کے ہیں۔ یہ قاعدہ صرف میں مسلم ہے کہ تصغیر کے وقت محذوفہ حروف اصلی لوٹ آتے ہیں چنانچہ ارضٌ کی تصغیر اریضۃٌ ہے جس میں تائے محذوفہ تصغیر کے وقت لایا گیا۔

یہاں یہ بات خیال میں آتی ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی تصغیر یا تحقیر کرے اُس کی دل شکنی ہوتی ہے۔ اس لئے اُس کے صلہ میں یہ فیضان ہوتا ہے کہ اُس کے نقص کو دفع کر کے اُس کی تکمیل کی جاتی ہے۔ جس طرح تصغیر کے وقت کلمہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

دیکھئے انسان اصل میں انسیان تھا جب کثرت سے لوگ اس کا ذکر کرنے لگے اور شہرہ آفاق ہوا تو اس میں یہ تعلّی پیدا ہوئی کہ ہم بھی

ایسے ہیں کہ ہر طرف ہمارے چرچے ہوتے رہتے ہیں۔ بس یہی اُس کے نقص کا باعث ہوا۔ یعنی کثرت استعمال کی وجہ سے ایک جزو یعنی یا دور کرکے انسان بنا دیا گیا۔ پھر جب اس کی تصغیر و تحقیر ہوئی اور تکبّر ٹوٹا تو اُس کی تکمیل کر دی گئی۔ اور جو نقص تکبر کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اس تصغیر کی وجہ سے دور ہو گیا۔ اسی وجہ سے اولیاء اللہ جس قدر اپنی

ذاتی ذلت ہو اس سے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم ادہم علیہ الرحمہ کے حال میں لکھا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ ایک بار میرا گذر کسی مجمع پر ہوا چند اوباش وہاں دل لگی کر رہے تھے مجھے دیکھتے ہی ایک شخص ان میں سے میری ڈاڑھی پکڑ کر ادھر ادھر گھمانے لگا۔ چونکہ مجھ پر اس وقت فاقہ کی حالت تھی جب وہ ڈاڑھی کو جھٹکا دیتا میں گر جاتا۔ پھر وہ مجھے اُٹھاتا اور اُس پر تمام مجمع کے لوگ قہقہے لگاتے۔ آپ فرماتے ہیں جیسے مجھ پر اس تحقیر و تذلیل سے خوشی ہوئی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اصل وجہ اس کی یہی ہے کہ آدمی کے نفس میں ایک قسم کا عجب و تکبر ہوتا ہے۔ اُس کو اپنی تحقیر ہرگز گوارا نہیں ہوتی۔ جب ان حضرات کی تحقیر ہوتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اب نفس کا کفر ٹوٹا اور یہی ان کی تکمیل کا باعث ہوتا ہے اور حدیث شریف میں جو وارد ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ انا عند منکسرۃ القلوب یہ بھی اس کی

طرف اشارہ ہے اس لئے کہ تصغیر و تحقیر میں ضرور انکسار قلب ہوتا ہے
ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انسان کو انسان اس وجہ سے کہتے ہیں اُس نے روز الست جو عہد کیا تھا وہ بھول گیا۔ اس صورت میں مادہ اُس کا نسیٔ ہوگا اور انسیان اصل بروزن افعلان ہوا۔
اور انسان کے معنی تیزی کے بھی ہیں چنانچہ انسان السیف یعنی تیزی شمشیر اور انسان السہم بمعنی تیزی تیر ہے۔ چونکہ بعض انسانوں میں بھی تیزی بلا کی ہوتی ہے۔ اس لئے انسان نام رکھا گیا اور قرآن شریف میں ہے وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا۔ یعنی انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے اور انسان انس سے بھی ماخوذ ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں انسان بروزن فعلان ہوگا۔ چونکہ انسان میں صفت انس بھی ہوتی ہے جو اعلیٰ درجے کی صفت ہے۔ اس لئے اس کا یہ لقب ٹھیرا۔
غرضکہ انسان مذاقِ معقولیت پر اگرچہ نوع ہے۔ مگر درحقیقت ان صفات کے لحاظ سے ان میں متعدد انواع ہیں کوئی عہد فراموش کوئی تیز طبع جھگڑالو کوئی انست والا اس لحاظ سے یہ لفظ کلی متواطی نہ ہونا بلکہ مشترک ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ہر ایک کی حقیقت جدا ہے۔
حق تعالیٰ ہمیں وہ انسان بنائے جس کو اپنے مالک حقیقی کے ساتھ انس ہو وما توفیقی الا باللہ۔

ملک

(ملک) بادشاہ کو کہتے ہیں جس کا تصرف اور حکم نافذ ہو اور لوگ اپنے اپنے امن و آسائش میں اُس کے محتاج ہوں۔ ہرچند ملک اور مالک دونوں کا اشتقاق میم۔ لام۔ کاف سے ہے۔ مگر ملِک مُلک والے یعنی بادشاہ کو کہیں گے اور مالک مِلک والے کو ملک میں جو خصوصیات ہیں وہ مالک میں نہیں کیونکہ ملک کی اضافت عقلاء کی طرف ہوتی ہے اور مالک کی اضافت غیر ذوی العقول کی طرف۔ چنانچہ مالک الدواب یعنی جانوروں کا مالک کہتے ہیں اور ملک الدواب نہیں کہتے بلکہ ملک الناس کہیں گے۔

حق تعالےٰ کو منظور تھا کہ اس صفت کا اظہار فرما دے اس لئے تمدن کی بنیاد ڈالی گئی۔ جس سے ہر ملک کے لئے ایک بادشاہ کی ضرورت ہوئی چونکہ ہر فرد بشر میں بھی ایک مستقل سلطنت قائم ہے۔ اس لئے اس سلطنت کا بھی ایک بادشاہ مقرر فرمایا جس کا نام نفس ناطقہ ہے اور اُس کے لئے دو وزیر مقرر کئے۔ ایک وزیر خارجیہ دوسرا داخلیہ وزیر خارجیہ عقل ہے جس کا مقام اجلاس دماغ ہے۔

حس مشترک جس کو یونانی میں نبطاسیا یعنی لوح نفس کہتے ہیں۔ گویا یہ بارگاہ

ملک

سلطنت انسانی

سلطانی ہے یہاں دول خارجیہ کے اخبار و کیفیات پیش ہوا کرتی ہیں
دول خارجیہ سے مراد دوسرے اشخاص و اشیاء ہیں۔ کیونکہ ہر فرد انسان
وغیرہ میں ایک خاص سلطنت ہے جس کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ باصرہ کا کام ہے
کہ دول خارجیہ کے نقشے اور فوٹو پیش کر دیا کرے تاکہ سلطنت کو صدمہ پہنچانے
والی چیزوں سے حفاظت اور مفید چیزوں کے حاصل کرنے کی فکر کی جائے
دیکھئے جب بصارت عرض کرتی ہے کہ کوئی درندہ یا گزندہ وغیرہ حملہ
کرنے کو ہے تو اس سے حفاظت کا سامان کیا جاتا ہے اور مفید سلطنت
کوئی چیز ہو مثلاً عمدہ غذا وغیرہ کے متعلق عرض کردے تو اُس کو
سلطنت میں پہنچانے کی تدبیر کی جاتی ہے۔ یہ گویا عرض بیگی یا اڈی کانگ کا کام ہے
ڈاکخانے کی خدمت سامعہ سے متعلق ہے جو دور دور کی خبریں پیش کرتا
رہتا ہے۔ مثلاً فلاں مقام میں طاعون وغیرہ ہے جو مضر سلطنت ہیں اور
فلاں مقام میں مفید سلطنت چیزیں ملتی ہیں۔

حس مشترک میں باصرہ جتنے فوٹو پیش کرتا ہے اُن سب کا محافظ دفتر
خیال ہے جس کو مصورہ کہتے ہیں۔ یہ اس غرض سے محفوظ رکھے جاتے ہیں
کہ وقتاً فوقتاً ان سے ضرورتیں متعلق ہوتی ہیں۔ اگر یہ دفتر درہم برہم
ہو جائے تو ریاست میں اندھیر ہو جائے۔

سرحدی واقعہ نگار لامسہ ہے اس لئے کہ آدمی کا پوست سرحد کالبد انسانی ہے

اور اس میں قوت لامسہ رکھی گئی ہے جب اس سرحد میں کوئی نیا واقعہ پیش آیا مثلاً کانٹا چبھ گیا یا کسی گزندے نے کاٹا فوراً بذریعۂ تار برقی بارگاہ حس مشترک میں اس نے خبر کر دی۔

پولٹیکل امور وہم سے متعلق ہیں اس کا کام یہ ہے کہ باصرہ جن صورتوں کو پیش کرتا ہے ان میں وہ غور و فکر کرکے معانی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ شیر اور گھوڑے میں معنوی فرق کس قسم کا ہے۔ چنانچہ شیر سے عداوت اور ضرر رسانی کے معنی نکالتا ہے اور گھوڑے سے نفع رسانی کے۔ اس کی کارگزاری کے مثلیں جو تیار ہوتی ہیں اس کی محافظت حافظہ کرتا ہے جس کا نام متذکرہ بھی ہے جب کبھی باصرہ مکرر کوئی صورت پیش کرتا ہے جس کی ضرر رسانی اور عداوت مثلاً وہم نے تشخیص کی تھی متخیلہ اس کا پہلا فوٹو جو خیال میں رکھا تھا نکالتا ہے اس وقت حافظہ نے اس صورت سے اگر عداوت کے معنی استخراج کئے تھے تو وہ پیش کر دیتا ہے جس سے عقل حکم کرتی ہے کہ اس شخص سے حفاظت کی جائے اور اگر دوستی کا مضمون حافظہ نے پیش کیا تو محکمۂ وزارت سے اس کے ساتھ ملنے اور محبت رکھنے کا حکم نافذ ہوتا ہے۔

انتظام کلی متخیلہ سے متعلق ہے جس کو متفکرہ بھی کہتے ہیں وہ امور متعلقہ کو ترتیب دے کر نتیجہ نکالتا ہے مثلاً جب کسی زہری جانور کی صورت باصرہ

پیش کرے اور وہم اُس کا موذی ہونا ثابت کر دے تو متخیلہ یہ رائے پیش کرتا ہے کہ یہ موذی ہے اور جو موذی ہو اُس کو مارنا چاہئیے۔ چونکہ مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے کبھی متخیلہ کو خزانۂ خیال کی صورتوں میں گھٹانے بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً سانپ کی صورت کی تفصیل کرکے فقط اس کا دانت لے لیتا ہے اور یہ حکم لگا دیتا ہے کہ وہی مہلک ہے۔ اور مہلک دور کر دیا جائے تو پھر اس سے ضرر رسانی کا اندیشہ نہیں اور زیادتی کی مثال یہ ہے حضرت شیخ سعدی رح فرماتے ہیں ؎

گربۂ مسکین اگر پر داشتے

تخم کنجشک از جہاں بر داشتے

یہاں بلی کی صورت میں پر لگا دئے اور پر دار بلی بنائی گئی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باصرہ کسی کا فوٹو پیش کرتا ہے اور وہم اس کے حرکات سکنات سے محبت کے معنی استخراج کرتا ہے اُس وقت متخیلہ اس فکر میں ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کبھی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔ چنانچہ خیال میں جو صورتیں جمع ہیں اُن میں تلاش کرتا ہے کہ اُس وقت اُس کے افعال کس قسم کے تھے کیونکہ افعال کا خزانہ بھی حافظہ ہی ہے اگر حافظہ نے اُن کو تلف نہ کر دیا ہو تو وہ پیش نظر ہو جاتے ہیں اور اگر اُسی صورت سے وہم نے محبت کے معنی نکالے تھے تو فی الجملہ متخیلہ

کو اطمینان ہوتا ہے ورنہ اُس سے احتیاط کرنے کی ضرورت بتلاتا ہے - چنانچہ کسی کا شعر ہے ؎

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہیست
پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

باصرہ وغیرہ کی خبر رسانی کے بعد متخیلہ کی تحقیق میں جب یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی موذی سلطنت کو ضرر پہنچانے پر آمادہ ہے اُس وقت محکمہ حربی پر جس کا افسر قوت غضبیہ ہے حکم جاری کرتا ہے کہ انتظام کیا جائے وہ شجاعت کو جو خاص دشمن کی سرکوبی کے لئے مقرر ہے حکم دیتا ہے وہ پہلے تخویف کی غرض سے آنکھوں اور چہرہ کو ہیبت ناک اور آواز کو دہشت انگیز بنا کر اُس کے مقابلے میں پیش کرتا ہے اور ارادے اور قدرت کو حکم دیتا ہے کہ فوراً قوائے محرکہ کو حکم دیں کہ اوتار و عضلات وغیرہ کو اعضائے رئیسہ مسلط کرکے دشمن پر ان کا حملہ کرادیں - چنانچہ وہ مقابلہ کرکے دشمن پر فتح پاتے ہیں - اور کبھی جبن جس سے صیغۂ مصالح اندیشی اور امن قائم رکھنا متعلق ہے - یہ رائے پیش کرتا ہے کہ اس وقت بھاگ جانا مناسب ہے اور بمجرد منظوری جس طریقے سے غصہ فوج کو دشمن کے مقابلے میں لایا تھا اسی طریقہ سے بھاگنے کا کام اُس سے لیتا ہے -

یہ چند امور جو بیان کئے گئے وہ وزارت خارجیہ سے متعلق تھے - ان کے

سوا اور بہت سے کام اُس صیغے سے متعلق ہیں۔

اب وزارت داخلیہ کا بھی تھوڑا سا حال سماعت فرمائیے۔ نفس ناطقہ کا دوسرا وزیر قوت شہویہ ہے جس سے اس سلطنت کے اندرونی کام متعلق ہیں۔

اس سلطنت میں بہت سے اضلاع و تعلقات ہیں مثلاً معدہ جگر دل۔ دماغ۔ گوشت۔ پوست۔ عضلے۔ گردے۔ ہڈی۔ اور جھلیاں وغیرہ ہر ایک کی طبیعت خاص قسم کی ہے۔ اور وہاں کا وہی مقامی افسر اور تعلقدار ہے۔ کسی ضلع میں کوئی مخالفت پیدا ہو جائے تو وہ وہاں سے اس کو دفع کر دیتا ہے۔ مثلاً معدے میں کوئی ایسی چیز آجائے جو مضر ہو تو مقامی افسر یعنی طبیعت فوراً قے یا اسہال کے ذریعہ سے اس کو نکال دیتی ہے۔ صیغۂ کوتوالی بھی اسی سے متعلق ہے اور جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ شہوت یعنی خواہش کے روبرو پیش کرتی ہے اور وہ اُس کا انتظام کر دیتی ہے۔ مثلاً پانی کی ضرورت ہو تو اُس کی خواہش یعنی پیاس نفس ناطقہ کے حکم سے پانی وہاں پہنچا دیتی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس غذا اور مقویات اور ادویہ جوارشین وغیرہ حسب ضرورت ہر مقام میں پہنچاتی رہتی ہیں۔

اس سلطنت میں بہت سے محکمے قائم ہیں جن میں سے چند یہاں لکھے

جاتے ہیں

جاتے ہیں۔

محکمۂ تفتیش = اس کا کام یہ ہے کہ کسی مفسد کو اندر قدم نہ رکھنے دے۔ اس کے افسر ذائقہ اور شامّہ ہیں یہ جانچ کر انہی کو اجازت دیتے ہیں جو سلطنت کے حق میں مفید ہوں۔ صیغۂ طبابت بھی انہی سے متعلق ہے کہ مفید اشیاء کو اندر روانہ کریں۔ لیکن قوت عاقلہ کا حکم ہو تو اپنے خلاف مرضی اشیاء مثلاً دوائے تلخ اور کریہ کو بھی جانے دیتے ہیں۔

محکمۂ افزائش و توفیر۔ نامیہ سے متعلق ہے جو ضرورت سے زیادہ غذا فراہم کرتا ہے۔

محکمۂ فراہمی اشیاء مایحتاج۔ جاذبہ سے متعلق ہے جس طرح ایام قحط میں ایک مستقل عہدہ دار رعایا کی غذا فراہم کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اس سلطنت میں جاذبہ مقرر ہے چونکہ برس کے بارہ مہینے اس سلطنت میں قحط رہتا ہے۔ اس لئے ہر ضلع میں یہاں خاص طور کا جاذبہ مقرر ہے جو ادہر اُدہر سے غذا فراہم کرتا رہتا ہے۔

چونکہ غذا کی آمد و شد نلکیوں کے ذریعہ سے ہے اس لحاظ سے سررشتہ ریلوے سے بھی اُس کا تعلق ہے جس طرح کہ سررشتۂ آب پاشی سے بھی ہے اور اُن کا افسر جاذبہ ہوگا۔

جب جاذبہ ہر ایک کی روزی فراہم کر دیتا ہے تو قوت غاذیہ جو قسمت ارزاق پر مامور ہے۔ ہر ایک کو اس کی حیثیت اور ضرورت کے لحاظ سے روزی تقسیم کرتی ہے۔

محکمۂ آب پاشی بھی اسی سے متعلق ہے کیونکہ جب تک غذا سیال نہ ہو ہر عضو میں جا نہیں سکتی اس لئے پانی کی ضرورت ہے۔

قوت ماسکہ خزانہ دار ہے۔ جو ہر ضلع و مقام میں آمدنی کی حفاظت کرتی ہے

تعمیرات عامہ ۔ ہاضمہ سے متعلق ہے اس لئے کہ جو مقامات بوسیدہ اور تحلیل ہو جاتے ہیں ہاضمہ وقتاً فوقتاً بدلِ ما یتحلل پہنچا کر تعمیر کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر عضو کا ہاضمہ جدا ہے۔

صیغۂ کیمسٹری بھی اسی سے متعلق ہے۔ چونکہ غذا میں دو قسم کے اجزاء ہوتے ہیں۔ بعضوں میں جزو بدن ہونے کی صلاحیت ہے اور بعضوں میں نہیں ہاضمہ غذا کی تحلیل کرتا ہے۔ ابتدائیہ کیمسٹری معدہ میں ہوتی ہے کیلوس کے لطیف اور عمدہ اجزا علیحدہ کر کے جگر کی طرف بھیجتا ہے اور کثیف آنتوں کی راہ سے نکال دئے جاتے ہیں۔ پھر جگر میں تحلیل ہوتی ہے۔ لطیف اجزا بلغم۔ خون۔ صفرا اور سودا بنتے ہیں اور فضلہ مثانہ کی راہ سے نکال دیا جاتا ہے۔ پھر ان میں سے جو خون دل میں جاتا ہے وہاں لطیف اجزا روح حیوانی بنتے ہیں اور فضلات ناک

کان، آنکھیں۔ اور مسامات کی راہ سے نکال دئے جاتے ہیں۔ اور جو خون اعضا میں جاتا ہے وہاں قابل اجزا اعضا کے بننے میں صرف کئے جاتے ہیں اور باقی سے منی ناخن اور بال وغیرہ بنتے ہیں۔

محکمۂ صفائی ۔ قوت دافعہ سے متعلق ہے جو ہر مقام کی نالیوں اور موریوں وغیرہ کے میل کچیل اور فضلات دفع کرکے پاک وصاف کر دیتے ہیں اور ناظم جنگلات بھی وہی ہے اس لئے کہ ہضم رابع کے فضلات سے بالوں کی جھاڑیوں کو بڑھانا بھی اسی کا کام ہے۔

محکمۂ افزائش نسل کے افسر مولدہ اور مصورّہ ہیں۔ ان کے سوا اور بہت سے محکمے اس سلطنت میں قائم ہیں جو بیان کئے گئے اُن کو مشتے نمونہ از خروارے سمجھنا چاہئیے۔ اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو ایک وسیع سلطنت پیش نظر ہو جائیگی۔ دیکھئے فلسفۂ جدیدہ باوجود اس کے کہ انسان کے حصے علاوہ علحدہ کرکے ہر حصہ کے معلومات میں روز افزوں ترقیاں کر رہا ہے مگر خود اس کے اعتراف سے ثابت ہے کہ ہنوز روز اوّل ہے۔

غرضکہ اس وسیع سلطنت کا بادشاہ نفس ناطقہ ہے اور کیسے کیسے متضاد اقوام اس میں سکونت پذیر ہیں۔ مثلاً آب آتش باد خاک شجاعت۔ حلم۔ تکبر۔ تواضع۔ حسد۔ خیرخواہی۔ محبت۔ عداوت رقیق۔ غلیظ۔ سخت۔ نرم۔ سرد۔ گرم۔ جاذبہ۔ دافعہ وغیرہ

مگر کوئی کسی پر تعدی نہیں کرسکتا۔ سب اس بادشاہ کے مطیع اور فرماں بردار اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔

چونکہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف واقع ہوا ہے۔ اس لئے ایسے اسباب حق تعالےٰ نے قائم کئے کہ خواہ مخواہ اُس کو تمدن قائم کرنے کی ضرورت ہوی اور ہر ملک والے اس بات پر مجبور ہوئے کہ اپنے ہی ہم جنس بادشاہ کی اطاعت کریں۔ اور اُس کو ایسے ذرائع دئے گئے کہ سب رعایا اُس کے محتاج ہوں۔

چونکہ آدمی کی نظر صورت پر پڑتی ہے اور بذریعۂ وہم اس کے اوصاف معلوم کرتا ہے اس لئے جو شخص بادشاہ کو دیکھتا ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ لوگوں کا بادشاہ ہے۔ اور کسی کا محتاج نہیں اور جو لوگ کامل العقل ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ حقیقی کوئی اور ہی ہے۔ کیونکہ یہ بادشاہ ظاہری بات بات میں اپنے خالق کا محتاج ہے جس طرح اُنہوں نے اپنے مملکت ذاتی میں اپنے نفس ناطقہ کو بن دیکھے بادشاہ مان لیا۔ اسی طرح خالق عز وجل کو بھی ملک الملک مان لیا اور جس طرح اپنے اعضاء و قوی کی حرکات کے نسبت یقین کرلیا کہ بغیر ارادہ نفس ناطقہ کے کوئی ان سے حرکت صادر نہیں ہوسکتی اسی طرح عقل سے یقین کرلیا کہ عالم میں کوئی حرکت بغیر ارادے

بادشاہ حقیقی کے صادر نہیں ہو سکتی۔ لا تتحرك ذرة الا باذن اللہ یہ ہیں معنی ملك الناس کے۔

نفس ناطقہ کی سلطنت اور بادشاہوں کی سلطنت میں یہ فرق ضرور ہے کہ اُن کے حکم نافذ ہونے میں بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ یہانتک کہ رعب قائم رکھنے کے لئے عدول حکمی کرنے والوں کو پھانسی تک دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر بھی کوئی حکم ان کا اس سرعت سے نافذ نہیں ہو سکتا جو نفس ناطقہ کا حکم نافذ ہوتا ہے۔

دیکھئے جب کوئی موذی اور مفسد سلطنت کی اطلاع باصرہ دیتا ہے تو پہلے متعلقہ دفتروں میں تلاش ہوتی ہے کہ اس قسم کے مفسدہ پرداز کی عرض ومعروض کبھی ہوئی تھی یا نہیں۔ اگر نہیں ہوئی تھی تو وہم فوراً جانچ کر عرض کر دیتا ہے کہ مفسد ہے یا نہیں۔ اور مثلیں برآمد ہوں تو متخیلہ فوراً قطعی رائے پیش کر دیتا ہے کہ وہ مثلاً قابل قتل ہے اور یہ مثل بھی ان مثلوں کے ساتھ دفتر میں رکھی جاتی ہے۔ پھر فوجی افسروں کو حکم نافذ ہوتا ہے چنانچہ وہ قتل کیا جاتا ہے۔

دیکھئے اتنے کام اس سرعت سے ہوتے ہیں کہ اُدھر بچھو مثلاً نظر پڑا اور ادھر اُس پر جوتا پڑا ابتدائی کارروائی سے نفاذ حکم بلکہ تعمیل حکم یعنی قتل تک ایک سکنڈ کا عرصہ بھی نہیں گذرتا اسی طرح الکسی تعجب خیز

بات پر نفس مطلع ہوتا ہے تو اندرونی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی عضلات وغیرہ اپنے اپنے کاموں پر مستعد ہو جاتے ہیں۔ اُدھر تنفس میں ایک غیر معمولی جوشش پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آواز بلند ہوتی ہے اور جلد جلد حرکت کرنے لگتی ہے ادھر اوتار وغیرہ مقامی عملہ ہونٹوں پر مسلط ہو کر ان کو دانتوں پر سے ہٹا دیتا ہے۔ چہرہ پر ایسی چیزیں فراہم کر دی جاتی ہیں جو آثار بشاشت ہیں جن سے دیکھنے والوں پر بھی خوشی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور باہمی انست پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر باطن میں غم یا غصہ آ جائے۔ کارگذاران مقامی آثار بشاشت سے چہرہ کو فوراً پاک وصاف کر کے آنکھوں میں ایک قسم کا انقلاب پیدا کر دیتے ہیں یہاں تک کہ کبھی آنسو جاری ہو جاتے ہیں جو کمال غم کی علامت ہے اس قسم کے اور بہت سے حرکات اعضا سے صادر کراتے ہیں۔ بلکہ بسا وقت ایسے حرکات صادر کرا دیتے ہیں جن سے حیثیت عرفیہ کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ انقلاب بے سبب نہیں ہوتا نفس میں تعجب کے وقت مثلاً کوئی کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ تعجب ہے کیا چیز۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کمال درجے کی خوشی سے بھی آدمی

ہنستا ہے۔ یہاں تک کہ بعضے شادی مرگ ہو جاتے ہیں کہ ہنستے ہنستے مرجاتے ہیں۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ اور گدگدیاں کرنے سے بھی آدمی بے اختیار ہنستا ہے۔ اور کبھی کسی کی دل شکنی اور رنج اور مصیبت پر بھی ہنستا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک بار نماز جماعت سے ہو رہی تھی جس کے امام خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ایک نابینا کمال شوق سے جماعت میں شریک ہونے کو آرہے تھے۔ اتفاقاً گڑھے میں گر پڑے اس پر بعض بے اختیار ہنس پڑے جس کی سزا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگوں کی نماز بھی ٹوٹی اور وضو بھی ٹوٹا۔ دیکھئے یہ نابینا بزرگ کس شوق و ذوق سے جماعت میں شریک ہونے کو آرہے ہوں گے اور جوں جوں صف کے قریب ہوتے ہوں گے کس قدر ان کو خوشی ہوتی ہوگی اور شکر کرتے ہوں گے کہ الحمد للہ محنت چیز ہوگئی اب کوئی دم میں اس جماعت سراپا رحمت میں شریک ہو جاتے ہیں جس کے امام خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تقرب الٰہی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ رحمت اور صلوٰۃ و سلام حق تعالےٰ کی طرف سے اس جماعت پر پیہم نازل ہو رہے ہیں۔ فرشتے ہر طرف صف باندھے ہوئے دعاگوئی میں مشغول ہیں۔ حق تعالےٰ خاص طور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس جماعت کی طرف متوجہ ہے

اور ہر شخص کو معراج حاصل ہے۔ جس سے اظہار راز و نیاز کا پورا موقع مل رہا ہے۔ ایسے وقت جب وہ بزرگ نابینا گر کر اس دولت سے محروم ہو گئے ہوں گے تو ان کے حسرت بھرے دل کا کیا حال ہو گا اگر آٹھ آٹھ آنسو اس پر روئیں تو سزاوار ہے۔ یہ تو ان کی حالت اُدھر اتقیا کی جماعت جن کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ ان پر اس گرنے اور محرومی کا اثر یہ ہو رہا ہے کہ بے اختیار ہنس پڑے۔ صحابہ کا اس وقت ہنسنا معلوم نہیں کس مصلحت سے تھا۔ اور خدا جانے اس وقت کس قسم کے معارف ان کے دلوں پر متجلی تھے۔ جن سے فرحت و بشاشت ہوئی اور بے اختیار ہنس پڑے۔ بارہا دیکھا گیا کہ ہنسی ہنسی میں رو دیتے ہیں اور روتے روتے ہنس دیتے ہیں۔ اسرار خالقیت کا انکشاف ہر کس و ناکس پر نہیں ہو سکتا۔ شعر

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است

بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ گریان است

ہر چند ان حضرات کی ہنسی کو ہم اپنی ہنسی پر قیاس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔ مگر چونکہ حکم شریعت عام ہوتا ہے اس میں خصوصیات باطنی کا لحاظ نہیں ہوتا اس لئے اس سزا میں وہ حضرات بھی شامل کر دئے گئے۔ دیکھئے صاف ارشاد ہے من تشبہ بقوم فھو منھم

یعنی

یعنی جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے یعنی اس کے باطن کا لحاظ نہیں۔

الحاصل ضحک اور غضب وغیرہ سے یہ ثابت ہے کہ نفس ناطقہ جو حکم کرتا ہے اس کی تعمیل ایسی فوراً ہوتی ہے کہ حکم اور تعمیل میں گویا زمانہ فاصل ہی نہیں۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ نفس ناطقہ کی حکومت اس کی سلطنت میں اس درجہ کیوں نافذ ہے کہ اس سے سرتابی کوئی نہیں کرسکتا۔ اور سلاطین کی حکومت میں یہ بات نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ نفس ناطقہ کو خاص قسم کا تعلق اس کی سلطنت سے دیا گیا ہے چنانچہ اس کی مفارقت سے تمام سلطنت درہم وبرہم ہو جاتی ہے یعنی جسم فنا ہو جاتا ہے اور یہ تعلق سلاطین کو ملک کے ساتھ نہیں۔

اب غور کیجئے کہ اس عطائی اور عارضی تعلق سے نفس کو یہ بات حاصل ہے کہ اس کا کوئی حکم اس کے ملک میں رد نہیں ہوسکتا تو خالق عالم جس کے ساتھ تمام عالم کو ایسا ذاتی تعلق ہے کہ ہر آن وہ اس کا محتاج بنا ہوا ہے صحابہ کے مذکورہ واقعات کو دیکھئے کہ ان پر جب نفس ناطقہ کے پیادے مسلط ہوئے اور وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ابھی مذکور ہوا تو اُن پر کس قدر شاق گذرا ہوگا۔ اور اُس کے رفع کرنے میں کیا کچھ کوششیں نہ کی ہونگی

مگر کچھ نہ چلی انجام کار نفس ناطقہ ہی کا حکم چل گیا - اور قہقہ کی آواز کو باہر نکال کر چھوڑا یہاں تک کہ ہنسی کا پورا نقشہ قائم کر دیا معلوم نہیں اس وقت ہنسانے والی قوت کیوں مسلط ہو گئی تھی - اگر کسی کا نقصان اور دل شکنی ہنسی کے اسباب میں سے ہے تو چاہئیے کہ اپنا پیارا لڑکا اور واجب التعظیم بزرگ گریں تو بھی ہنسی آنی چاہئیے حالانکہ نہیں آتی -

احمق کے حرکات دیکھنے سے بھی ہنسی آتی ہے - اگر اپنے کسی معزز دوست سے دیکھے جائیں تو بجائے ہنسی کے رنج ہوتا ہے اور شرم آتی ہے - غرضکہ تعجب جو باعث ضحک ہے اس کو معین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ جس بات پر ایک شخص ہنستا ہے دوسرا نہیں ہنستا - بلکہ ہم ہی جس بات پر ایک وقت ہنستے ہیں دوسرے وقت نہیں ہنستے - جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی شئے کو ہنسانے اور رولانے میں دخل نہیں بلکہ وہ خدا ہی کا کام ہے جب چاہتا ہے ہنساتا ہے اور جب چاہتا ہے رولاتا ہے - چنانچہ ارشاد ہے قوله تعالیٰ هو الذی اضحك وابكی یعنی وہی خدا ہنساتا ہی اور رولاتا ہے جب ہنسانا چاہتا ہے تو نفس میں ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ آدمی ہنس دے اور جب رولانا چاہتا ہے تو کوئی بات ایسی پیدا کر دیتا ہے کہ آدمی بے اختیار رو دے یہاں تک کہ ہنسنے کے

قابل بات میں بھی کبھی رولانے کی خاصیت دی جاتی ہے۔ عقل سے اس کا واقعی سبب ہرگز نہیں معلوم ہوتا جس سے تصدیق آیۂ موصوفہ کی ہوسکے کہ خدائے تعالےٰ ہی ہنساتا اور رولاتا ہے اور بظاہر جو اسباب قائم ہوتے ہیں ان کا مسبب وہی ہے۔

اس قسم کے امور اکثر نفس ناطقہ کی ساخت ہی میں داخل ہوتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ حکمائے یونان میں لکھا ہے کہ دیمو قراطیس جو بڑا نامی حکیم ہے وہ بہت ہنستا تھا یہاں تک کہ جس طرح خوشی کی حالت میں ہنستا۔ غم کی حالت میں بھی ہنستا تھا۔ اس کے خیر خواہوں نے دیکھا کہ یہ بالکل غیر معمولی بات ہے۔ اس کو جنون پر محمول کیا اور شہر بدیرہ جس میں وہ رہتا تھا وہاں کے لوگوں نے اس کے علاج کے لئے بقراط کو بلایا چنانچہ وہ جنون کی دوائیں ہمراہ لایا پہلے اس نے دودھ پیش کیا دیمو قراطیس نے غور سے اس دودھ کو دیکھ کر کہا کہ یہ ایسی بکری کا دودھ ہے جس کا رنگ سیاہ ہے اور وہ باکرہ بھی ہے فی الواقع اس کی بات صحیح نکلی بقراط اسکی فراست سے متعجب ہوا اور کئی روز وہاں رہکر مسائل حکمیہ کی تحقیق کی اور اس کی غیر معمولی حکمت سے متعجب ہو کر کہا کہ اس شہر کے لوگ اس قابل ہیں کہ ان کے جنون کا علاج کیا جائے نہ یہ حکیم۔

غرضکہ فاعل مختار نے جس کو جیسا چاہا پیدا کیا کسی کو کثیر الضحک کسی کو

کثیر البکار پھر جس کو جب چاہتا ہے ہنساتا ہے اس کی مصلحت وہی جانے
اس کا حکم عالم میں کیونکر رد ہوسکے اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام
دعا کیا کرتے تھے کہ الٰہی قوم کو ہدایت دے اور راہ راست پر لا۔ اس سے
ظاہر ہے کہ کفار کے دل خدا ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ اور حکم ایمان جب
ان کے ذریعہ سے کفار کو پہنچتا ہے وہ ایسا ہے جیسے نفس ناطقہ کا حکم
اعضا پر بذریعۂ کلام وزبان پہنچے کہ حرکت کرو اگر صبح سے شام تک ہاتھ کو
حرکت کرنے کے لئے زبان سے کہا جائے تو ممکن نہیں حرکت کرسکے جب تک
کہ نفس ناطقہ کا اندرونی حکم اس کو نہ پہنچے۔ اسی طرح خدائے تعالے
کا امر تکوینی جو باطن میں صادر ہوتا ہے وہ ہرگز رد نہیں ہوسکتا۔

اب رہی یہ بات کہ بغیر امر تکوینی کے مقصود حاصل نہیں ہوتا تو انبیاء کی
ضرورت ہی کیا۔ اس سوال کا حق کسی کو نہیں ہے۔ خالق مختار ہے جو چاہے
کرے بندے کا کام اطاعت ہے اگر وہ ہوسکے تو یہ سمجھنا چاہئیے کہ
آثار کچھ اچھے ہیں۔ اور امید بخشائش ہے ورنہ آثار ٹھیک نہیں جب
قیامت میں آنکھیں کھل جائیں گی۔ اُس وقت خدا کی حجت قائم ہوجائیگی
کیونکہ وہ مالک الناس ہے اپنی سلطنت میں جو چاہے کرے اُس سے
کوئی پوچھ نہیں سکتا۔

دیکھئے نفس ناطقہ داڑھی کو بلکہ کسی مصلحت سے ہاتھ پاؤں کو کٹوا دیتا ہے

اور کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ میرا کیا قصور تھا۔ اسی طرح خدائے تعالیٰ سے کوئی پوچھ نہیں سکتا جس طرح اس کی مصلحت مقتضی ہوتی ہے عمل میں لاتا ہے۔

اللہ

(اللہ) کے معنی معبود کے ہیں مگر اس کے ماخذ میں اختلاف ہے۔ بعضوں کا قول ہے کہ وَلَہَ سے ماخوذ ہے اور وَلَہَ اس حرکت کو کہتے ہیں جو آدمی کسی مصیبت اور آفت کے وقت گھبرا کر اپنے مربی اور حامی کی طرف رجوع کرتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے ولہ الطفل الی امہ یعنی بچہ گھبرا کر اپنے ماں کی طرف لپکا۔ اس صورت میں اللہ کی اصل ولاہ ہوئی۔ اور جس طرح وِشاح میں واؤ الف سے بدلی گئی۔ یہاں بھی بدلی گئی اور معنی یہ ہوے کہ اللہ وہ ذات ہے کہ جس کی طرف کل آفتوں میں لوگ گھبرا کر رجوع کریں اور بعض کہتے ہیں کہ اللہ اپنے اصل پر ہے جس کا وزن فعال و معنی مفعول ہے۔ جیسے امام اس شخص کو کہتے ہیں جس کی اقتدا کی جائے۔ الوہت اور الوہیت کے معنیٰ عبادت کے ہیں۔ اس صورت میں اللہ بمعنی معبود ہوا۔ ہر چند بہت سے لوگ خدائے تعالیٰ کے سوا غیروں کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ اور گھبراہٹ کے

وقت اوروں کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں مگر خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ سب آدمیوں کے اللہ ہم ہیں تو اس سے سمجھا جاتا ہے کہ یہ باعتبار واقع کے ارشاد ہے۔ کیونکہ عالم میں کوئی ایسا نہیں جو معبود یا ہر حال میں پناہ دینے والا بن سکے۔ جس کو دیکھئے خود محتاج ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اللہ غنی وانتم الفقراء پھر اگر کسی کو پناہ ملی تو دراصل وہ خدا ہی کی پناہ ہوگی۔ ہر چند غیر سے پناہ لینے والا اپنے اعتقاد کے نظر سے گنہگار ہوگا مگر دراصل وہ خدا ہی کی پناہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اس کو اس عالم میں باقی رکھنے کا ارادہ فرمادیا اس وقت تک تمام آفات مہلکہ سے بچانا ایک لازمی امر ہے۔ اگر بالفرض خدائے تعالیٰ اس کو پناہ نہ دے اور اس کا دشمن اس کو ہلاک کردے تو خلاف مشیت و تقدیر ہوگا۔ اس صورت میں الٰہ الناس ہونا ہر طرح خدائے تعالیٰ ہی کو مسلم ہوا گو کسی دوسرے سے پناہ لے البتہ خدا کو چھوڑ کر دوسرے کی پناہ لے اور حمایت میں جائے اور اس کو مستقل سمجھے تو بسبب خیال کافر یا گنہگار ہوگا۔ اور دوسرے کی پناہ یا حمایت کو خدا ہی کی پناہ اور حمایت سمجھے تو اس عقیدہ کی وجہ سے کوئی الزام اس پر عائد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہاں توحید الوہیت مقصود ہے جیسے رب الناس میں توحید ربوبیت مقصود تھی اس طرح جس کی عبادت کی جاتی ہے

دراصل وہ خدا ہی کی عبادت ہوگی۔
کیونکہ سوائے خدائے تعالےٰ کے اور کوئی معبود ہو ہی نہیں سکتا مگر جس نے اپنی دانست میں غیر اللہ کو قابل عبادت سمجھا اور اللہ الناس جو نص قطعی ہے اس کی مخالفت کی تو ضرور مستحق عذاب ہوگا۔ اس صورت میں الوہیت ایک ہی ذات میں منحصر ہوگی اور لا الٰہ غیرک کے معنی صادق آگئے یعنی کوئی الٰہ بحیثیت الوہیت غیر نہیں۔ کیونکہ سوائے خدائے تعالےٰ کے کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی۔ البتہ باعتبار ذات کے غیر ہے کیونکہ وہ خالق قدیم ہے اور یہ مخلوق حادث دونوں کیونکر ایک ہو سکیں۔ ہر چند ہر عابد خدا کی عبادت کرتا ہے مگر مشرکوں کے خیال میں یہ نہیں ہوتا کہ ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون یعنی میں نے جن و انس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں اور اسی وجہ سے مشرک اور وہ لوگ جو اس عالم میں خدا کی عبادت نہیں کرتے دوسرے عالم میں دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ کیونکہ قید خانہ کی خاصیت ہی کہ وہاں خدا یاد آتا ہے۔ چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

جملہ رنداں چونکہ در زنداں روند
متقی و زاہد و حق خواں شوند

چونکہ اصل عبادت یاد آلہی ہے وہ دوزخ میں ہوا کرے گی اور خدا کو جب بصدق دل خوب پکاریں گے اور جو لوگ اس عالم میں عبادت کر چکے وہ اُس عالم میں عبادت سے معاف کئے جائیں گے۔ کیونکہ جنت دار تکلیف نہیں ہے۔ حق تعالے ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ اس عالم میں عبادت کی تکلیف اُٹھا کر اُس عالم میں فارغ البال ہو جائیں۔

شر

(شرّ) ضد خیر ہے اس آیۂ شریفہ میں شیطان وسوسہ انداز کی شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ پناہ مانگنے کے قابل شیطان کا شر ہے نہ شیطان۔ کیونکہ فی نفسہ اُس سے ہمیں کوئی تعلق نہیں اگر ہمیں وہ شر نہ پہنچائے تو مثل اور اشیائے عالم کے وہ بھی ایک شئے ہو گا جس سے نہ بھلائی کی امید نہ بُرائی کا خوف اس میں شک نہیں کہ کسی کو شر یا خیر پہنچانا کسی کی قدرت میں نہیں جب تک خدائے تعالیٰ نہ چاہے کوئی شر پہنچا سکتا ہے نہ خیر۔ دیکھئے ہر آدمی کے کس قدر دشمن ہیں پہلے سب سے بڑا دشمن اسی کا نفس ہے جیسا کہ ارشاد ہے اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک کیونکہ تمام شر و فساد کا مبدا نفس ہی ہے۔ اس لئے کہ جتنی نفسانی خواہشیں

ہیں سب اسی میں ہیں۔ اگر ان خواہشوں کو آدمی پوری کرنا چاہے تو خسر الدنیا والآخرۃ ہو جائے مثلاً جب خواہش نفسانی کے جوش کے وقت کسی خوبصورت عورت سے ملوث ہو جائے تو ظاہر ہے کہ دنیا ہی میں کیسی کیسی مصیبتیں بھگتنی پڑینگی اور آخرت میں کیا حشر ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس کل نفسانی خواہشوں کا بھی یہی حال ہے۔ قید خانے جتنے بھرے ہوئے آپ دیکھتے ہو سب نفس ہی کے کرتوت سے ہیں جس کو آپ پریشان مصیبت زدہ پاؤگے اصلی سبب اُس کا نفس ہی کی کارسازی ہوگی۔ غرضکہ سب سے بڑا دشمن ہماری ہی ذات میں ہے جس سے ہم بھاگ نہیں سکتے۔ پھر ہماری اہل و اولاد جن کو ہم سب سے زیادہ دوست سمجھتے ہیں۔ وہ بھی ہمارے دشمن ہیں حق تعالےٰ فرماتا ہے اولادکم عدولکم یعنی تمہاری اولاد تمہاری دشمن ہے۔ اُس کے بعد اہل قرابت ہیں چنانچہ کسی بزرگ کا قول ہے الاقارب کالعقارب ان کے بعد دوسرے لوگ علیٰ حسب مراتب ہیں۔ یہ تو ہمجنسوں کا حال تھا اس کے بعد جنات و شیاطین بھی ہمارے دشمن ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے اور وہ ہمیشہ ہمارے گرد و پیش رہتے ہیں اور ہم پر مسلط ہو سکتے ہیں۔ پھر حیوانات میں اگر دیکھتے ہیں تو بے انتہا موذی جانور ہیں جن کا شمار نہیں۔ ان کے سوا بیماریاں سب بے انتہا ہیں۔ اگر شفا خانوں میں چند روز

جاکر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کیسی کیسی آفتوں میں لوگ مبتلا ہیں ان سب بیماریوں کے اسباب وہی اخلاط ہیں جو ہم میں موجود ہیں ان کی کمی وزیادتی اور انحراف انہی غذاؤں سے ہوتا ہے جو ہم ہر روز کھاتے ہیں۔

غرض ان تمام اسبابِ شر پر نظر ڈالی جائے تو ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت اور آفت میں مبتلا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بے انتہا دشمنوں میں سے اگر ایک دو بھی ہر روز مسلط ہوتے رہیں تو ممکن نہیں کہ آدمی آسائش سے بسر کر سکے۔ مگر جب تک حق تعالٰے کو منظور ہوتا ہی کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ الحاصل خیر و شر کا پہنچانا خاص خدائے تعالےٰ کا کام ہے اسی وجہ سے جن حضرات کو اس امر کا مشاہدہ رہتا ہے وہ وسائط کو نظروں سے ساقط کر دیتے ہیں اور کسی چیز کی برائی اور بھلائی پر ان کی نظر بھی نہیں پڑتی۔ ہمیشہ ان کو صفات الٰہیہ میں استغراق رہتا ہے۔ ان کی نظروں میں سانپ اور لکڑی یکساں رہتی ہے۔ دونوں کو اس بات میں برابر سمجھتے ہیں کہ بغیر مشیت و ارادۂ الٰہی کے وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ اس صفات کے حضرات بہت اعلیٰ درجے کے ہیں اور ہمیشہ ان کو قربِ الٰہی حاصل ہے۔ مگر ان سے بڑے ہوئے وہ عارفین ہیں کہ جس طرح خدائے تعالےٰ نے عالم میں اسباب مقرر کئے ہیں

ان کو وہ بیکار نہیں سمجھتے۔ مضر چیز کو مضر اور مفید کو مفید جانتے ہیں خدائے تعالےٰ نے جس کی طرف بُرائی منسوب کی اُس کو بُری سمجھتے ہیں اور اس سے احتراز کرتے ہیں۔ مگر مؤثر اور فاعل مطلق حق تعالےٰ ہی کو جانتے ہیں وہ اسباب کے قائل ہیں۔ مگر ان کو مستقل نہیں سمجھتے یوں تو ہر مسلمان کا دعوےٰ ہے کہ یہی میرا عقیدہ ہے۔ مگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ دعوے کہاں تک صحیح ہے ہمیشہ دیکھنے اور سننے اور تجربوں سے اسباب کی اس قدر تاثیر ذہن میں متمکن ہے کہ خدائے تعالیٰ کا خیال بھی نہیں آتا اور اگر کہنے سننے سے آبھی گیا تو وہ دیرپا نہیں عاقل وہی ہے کہ اس خیال کو پختہ کرے اور اعتقاداً اور عملاً فرمان الٰہی بجا لائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

اور تمام دشمنوں پر اس کو غلبہ حاصل ہوگا۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ کہنے سننے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ جب عارضی سننے کا یہ اثر ہو تو ابتدائے نشو و نما سے جو باتیں ہر وقت سنی جاتی ہیں اور صرف سننا ہی نہیں بلکہ ذاتی مشاہدے بھی اس کے ساتھ ہوں تو ان کا کس قدر اثر ہونا چاہئیے۔ دیکھئے کہ قبل اس کے کہ آدمی ہوش سنبھالے یہ سمجھتا ہے

کہ ماں کی آغوشِ تربیت میں پرورش پا رہا ہے نہ کوئی اس حالت میں اسکا مونس ہے نہ مددگار اس وقت اُس کا یہی خیال ہوتا ہے کہ تمام عالم میں اگر کوئی اپنا مربی اور پرورش کرنے والا ہے تو وہی ایک ماں ہے۔ اس سے آگے اس کی نظر نہیں بڑھ سکتی جب اس کو کوئی حاجت ہوتی ہے تو ماں ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ غرضکہ اس وقت اُس کی ماں اُس کے حق میں ہر مرض کی دوا ہے۔ پھر جب ہوش سنبھالتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ماں بات بات میں باپ کی محتاج ہے۔ جب تک وہ کچھ نہ دے کچھ نہیں کرسکتی اُس وقت باپ کی وقعت اُس کی نظر میں پیدا ہوتی ہے۔ اور جوں جوں باپ کی طرف سے اُس کی پرورشی کے سامان ہوتے جاتے ہیں اور اُس کا ادراک بڑھتا جاتا ہے سمجھتا ہے کہ اپنی پرورشی کا مدار باپ پر ہے۔ اس وجہ سے اس سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت جس قدر اُس کی نظروں میں باپ کی وقعت ہوتی ہے کسی دوسرے کی نہیں ہوتی اور باپ سے بہتر کسی کو نہیں سمجھتا اس کے بعد جب شعور آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اپنا باپ اور سب کنبے والے بلکہ سب شہر اور ملک کے لوگ بادشاہ کے محتاج اور فرماں بردار ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہی ملک میں تصرف کرتا ہے اور اہل ملک کے خوف ورجا اسی سے متعلق ہے تو بادشاہ کی عظمت و وقعت ایسی ذہن نشین ہوتی ہے کہ کسی دوسرے کی

نہیں ہوتی پھر جس قدر عقل کامل ہوتی جاتی ہے۔ بادشاہ کی اطاعت فرمانبرداری کو ضروری سمجھتا ہے۔ غرضکہ مخلوق ہی کی طرف ہر وقت نظر اُس کی لگی رہتی ہے جس سے خدائے تعالےٰ کی طرف متوجہ ہونے کا اُس کو موقع ہی نہیں ملتا۔ اگرچہ کہ اس عرصہ میں واعظوں اور اساتذہ سے سنتا ہے کہ تمام عالم کا خالق خدائے تعالےٰ ہے۔ اور دیکھتا بھی ہے کہ ہر قوم اور ملت کے لوگ اپنے اپنے طریقوں پر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اور عقل سے بھی معلوم کر سکتا ہے کہ زمین اور آسمان وغیرہ کا پیدا کرنا کسی آدمی کا کام نہیں۔ اس لئے اُس کا کوئی خالق ضرور ہے جو سب کی حاجتوں کی اشیاء کو غیب سے فراہم کرتا ہے۔ مگر چونکہ خدائے تعالےٰ اور اُس کے تصرف مخفی طور پر ہیں اور ابتدائے پیدائش سے جب اُس کی نظر پڑی تو لوگوں ہی کے تصرفات اور حاجت روائیوں پر پڑی اس لئے اس کا یہ خیال پختہ نہیں ہوتا کہ عالم میں کل تصرفات خدائے تعالیٰ ہی کے جاری ہیں۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ جب حق تعالےٰ کو خالق عالم سمجھا اور ہر قوم کے لوگوں کو اُس کی عبادت کرتے پایا تو جس طرح بادشاہ کی وقعت سب سے زیادہ اُس کے ذہن نشین ہوئی تھی۔ حق تعالیٰ کی وقعت اس سے زیادہ ہوتی۔ مگر شیطان اُس کو وہاں جمنے نہیں دیتا۔ اس وجہ سے کہ عزازیل کو پہلے ظاہر تقرب الٰہی حاصل تھا جب آدم علیہ السلام کو خلعت خلافت عطا ہوئی۔ اور تمام ملائک سے

ان کی تعظیم وتوقیر اور سجدے کرائے گئے۔ اس کو بھی سجدے کا حکم ہوا
مگر کثرت عبادت کے گھمنڈ پر انکار کیا۔ اور تقرب آلہی سے دور پھینکا گیا۔
جس کی وجہ سے اس کا نام شیطان ٹھیرا۔ کیونکہ شیطان کے معنی لغت میں
دور کے ہیں۔ غرضکہ اُس وقت سے آدم علیہ السلام کا جانی دشمن ہوگیا
اور اُن کی وجہ سے ان کی اولاد کا بھی دشمن ہوا۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے
ان الشیطان لکم عدو مبین پہلے وہ آدم علیہ السلام کے
سر ہوا یہاں تک کہ اُن کو جنت سے زمین پر لاکر چھوڑا۔ ان کے بعد اُن کی
اولاد کو خدا کی راہ سے بھٹکانے کا بیڑا اُٹھایا اور قسم کھالی کہ گو یہ خلیفہ زادے
ہیں۔ مگر اُن کو بھی خدا کے راستہ سے ایسا بھٹکادوں گا کہ اُس راستہ
میں قدم نہ رکھنے پائیں۔ چنانچہ حق تعالےٰ اُس کا قول نقل فرمایا ہے۔
فبعزتک لاغوینھم اجمعین اور دل میں یہ بات ٹھان لی
کہ جس طرح ہوسکے دشمن اور اُس کے خاندان کو اگر تباہ نہ کردوں تو میں جن
نہیں اور عرض کیا کہ مجھ ستم رسیدہ پر اتنا فضل فرما کہ جب تک ان کی اولاد
روئے زمین پر رہے مجھے بھی رہنے کی اجازت ہو تا کہ میں بھی اپنی سوزش
دل کو ٹھنڈی کروں۔ چونکہ خدائے تعالےٰ رب العالمین ہے سب کی سننا
ہے خصوصاً شکستہ دلوں کی۔ اس بارگاہ میں بہت کچھ چل جاتی ہے ارشاد
ہوا کہ ہم نے مہلت منظور کی۔ اُس کے بعد درخواست کی کہ اُن کے گرفتار

کرنے کو چند دام بھی عنایت ہوں تو موجب کرم ہے۔ جیسا کہ مولانائے روم فرماتے ہیں ؎

گفت ابلیس لعین دادار را　　دام زفتے خواہم ایں اشکار را
زر و سیم و گلۂ اسپش نمود　　کہ بدیں تانی خلائق را ربود
گفت شاباش و ترش زیں شاد کام　　لیک افزوں بایدم زیں ام دام
پس زر و گوہر ز معدن ہائے خوش　　کرد آں پس بازہ را حق پیش کش
گیر ایں دام دگر را اے لعیں　　گو بیا فزوں دہ مرا نعم المعیں
چرب و شیریں و شرابات ثمیں　　دادش و صد جامۂ ابریشمیں
گفت یارب بیش ازیں خواہم مدد　　تا بہ بندم شان بحبل من مسد

غرض اس قسم کے بہت سے اسباب ضلالت دے گئے جس کی تصدیق اس آیۂ شریفہ سے ہوتی ہے قولہ تعالیٰ کلا نمد ھٰولاء وھٰولاء من عطاء ربک وما کان عطاء ربک محظورا یعنی ہم ہر ایک کو مدد دیتے ہیں ان کو بھی اور ان کو بھی اور تمہارے رب کی عطا سے کوئی محروم نہیں۔ اور ارشاد ہوا کہ جس طرح تجھ سے ہو سکے اپنی ذات سے اور اپنے لشکر کی مدد سے اطمینان کے ساتھ اپنے دل کے حوصلے پورے کر کما قال تعالیٰ واجلب علیھم بخیلک ورجلک بلکہ اُن کے دلوں پر بھی تجھے تصرف عنایت کرتے ہیں۔ تو ان کی نظر میں

سچا کر اندر ہی اندر مخالفانہ مشورے دیا کر مگر یہ یاد رکھنا کہ جو خاص ہمارے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ غرضکہ خدا سے پروانگی مل گئی اب کیا تھا نہایت بے باکی اور اطمینان سے ایک مستقل سلطنت اپنی قائم کر لی۔ اور اُن ذرائع کی تلاش میں مصروف ہوا جن سے لوگ خدا سے دور ہو کر لقب شیطان کے مستحق ہوں۔ دیکھا کہ ہر شخص بقائے شخصی اور بقائے نوعی کا دلدادہ ہے اور یہی چاہتا ہے کہ آپ اور اپنی نوع باقی رہے بس یہیں اس نے اپنا ٹھانہ جمایا اور ہر ایک کو یہ مشورہ دینے لگا کہ تمہاری پرورش بھی ماں باپ سے متعلق تھی۔ اس کے بعد دوسرے اسباب و ذرائع سے متعلق ہوئی۔ جن کو تم خوب جانتے ہو۔ اور تمہارے ذاتی تجربے ہیں اور بقائے نوعی سلاطین سے متعلق ہے کیونکہ اگر وہ نہ ہو تو تمدن درہم اور برہم ہو جائے اور درندے اور درندہ خو لوگ تمہیں پھاڑ کھائیں اور بعض اولڈ فیشن کے لوگ جو خدا کا خیال کرتے ہیں سو اول تو خدا کو کس نے دیکھا اور اگر ہو بھی تو خدا جانے کہاں ہے۔ نیو فیشن والوں کے عقل کا مقتضیٰ تو یہ نہیں کہ ایسے موہوم خیالات پر آدمی بھروسہ کرے اور اپنے ذاتی تجربے پر اعتماد نہ کر کے ہر بات میں خدا کو پکارے اور اُس کی عبادت میں اپنا وقت ضائع کرے۔

ہر چند خدائے تعالےٰ اس کے مقابلے کے لئے انبیا کو بھیجا کہ اپنے بھائی

اولادآدم علیہ السلام کو اس کے مکروفریب پر مطلع کرکے خدائے تعالےٰ اسی
اُن کو قریب کردیں۔ اُنہوں نے بہتیرا سمجھایا کہ بھائیو خدائے تعالےٰ ہی رب العالمین
اور سب کا پرورش کرنے والا ہے اور وہی تمام جہان کا بادشاہ ہے۔ اور
بادشاہ بھی کیسا مالک الملک یؤتی الملک من یشاء۔ یعنی جس کو چاہے
بادشاہ بنادے۔ ظاہرا اُنہوں نے بہت کچھ سمجھایا مگر ان کی کچھ نہ چلی کیونکہ
وہ اندر ہی اندر دلوں میں یہ وسوسے ڈالتا جاتا ہے کہ دیکھو اگر تم ان لوگوں کی
بات مان لوگے اور دنیا کے کاروبار چھوڑ کے خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤگے
تو سردست تمہیں فقروفاقہ کی مصیبت بھگتنی پڑے گی۔ چنانچہ حق تعالیٰ
فرماتا ہے الشیطان یعدکم الفقر اس کا مطلب یہ ہے
کہ شیطان فقر سے متعلق وسوسے ڈالتا ہے اور گویا وعدہ کرتا ہے کہ
جہاں تم نے انبیا کی سنی فقیری تم پر آگئی اور بادشاہ اور تمہارے آقا جب
تمہیں دیکھیں گے کہ تم خدا کی طرف متوجہ ہو تو یہی کہیں گے کہ یہ ہمارے
کام کے نہیں اور کوئی عہدہ تمہیں نہ ملیگا۔ غرضکہ ان کو پیٹ کے دھندوں
اور جاہ طلبی میں ایسا مصروف کر دیتا ہے کہ خدا کا خیال بھی کبھی نہ آنے
پائے۔ پیغمبروں نے ہزار طرح سے سمجھایا اور خدا کا کلام پڑھ پڑھ کر
سنایا تو بھی ان (وسوسوں) کے مقابلے میں کچھ اثر نہ ہوا۔ وسوسے
جو فی الحقیقت شیطان ان کو مشورے دیتا ہے ان کے سامنے وہ ایسا

متذلل اور فرماں بردار ہو جاتے ہیں۔ کہ شیطان کے ان حکموں سے ذرا بھی سرتابی نہیں کر سکتے یہی معنی عبودیت کے ہیں۔ اہل انصاف سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص خدا کی نہ مان کر شیطان کی مانیں تو کیا وہ عبداللہ سمجھا جائے گا؟ برخلاف ان کے جو خاص خدا کے بندے ہیں ان پر شیطان کا افسون نہیں چل سکتا وہ جانتے ہیں کہ خدا ہی پرورش کرنے والا ہے۔ اگر غذا کی وجہ سے طاقت آتی ہے تو اس میں طاقت دینے والا بھی خدا ہی ہے اور اگر کوئی پرورش کرتا ہے تو اُس کو متوجہ کرنے والا بھی خدا ہی ہے اور اگر بادشاہ کی طرف سے تمدن قائم ہے تو وہ ظلی طور پر حاکم ہے اصل مالک الملک وہی خدائے تعالےٰ ہے۔ غرضکہ وہ وساوس شیطانی پر لا حول پڑھکر ان کو دور کر دیتے ہیں وہ خدا ہی کو معبود اور قابل اطاعت سمجھتے ہیں۔ خدا کے مقابلے میں شیطان کی اطاعت کو کفر جانتے ہیں ہر حال میں ان کی توجہ خدا ہی کی طرف ہوتی ہے۔ اور ہر وقت تقرب الٰہی ان کو حاصل رہتا ہے۔ اور شیطان جتنا اُن کو اس بارگاہ سے دور کرنا چاہتا ہے وہ نزدیک ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی ہے کہ اُنہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ خدائے تعالےٰ ہی سب آدمیوں کا بلکہ کل عالم کا رب اور مالک ہے۔ یہی مستحکم اعتقاد ان کا ایک محکم قلعہ ہے جس کے اندر جانے کا راستہ ہی شیطان کو نہیں مل سکتا۔

یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ من شر الوسواس الخناس
ارشاد ہوا یعنی وسوسہ انداز خناس کے شر سے پناہ مانگو یہ نہیں ارشاد
ہوا کہ اُس کے وسوسہ کے شر سے پناہ مانگو۔ اس سے ظاہر ہے کہ سوائے
وسوسہ اندازی کے اور بھی اُس کے شر ہیں۔ اس لئے اس کی کل شرارتوں
سے پناہ مانگنی چاہیئے۔ مثلاً ایک شرارت اُس کی یہ ہے کہ کسی دوسرے
کو ورغلا کر کوئی حرکت اس سے ایسی صادر کرا دیتا ہے کہ خواہ مخواہ آدمی کو
غصہ آجائے۔ اور غصہ کی حالت میں ایسے کام اس سے کرا دیتا ہے کہ
دنیا و آخرت میں ذلت اور خرابی کے باعث ہوتے ہیں۔ چنانچہ
اکثر دیکھا جاتا ہے کہ احباب کے مجمعوں میں کمال خوشی سے
باہم گفت و شنید ہوتی ہے۔ ہنسی ہنسی میں کوئی نہ
کوئی صاحب کمال صفائی سے ایسی بات کہدیتے ہیں کہ مخاطب کو
ناگوار ہو۔ مگر اہل مجمع اُس سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ اس بات کا اثر
یہانتک ہوتا ہے کہ سب و شتم بلکہ قتال و جدال تک نوبت پہنچ جاتی ہے
دراصل یہ شرارت اسی وسوسہ انداز کی ہے کہ دوستی کے پیرایہ میں دوسرے
سے وہ بات کہلوائی اور ادھر غصہ کی حالت میں اپنا کام کر لیا۔ غالباً یہی
وجہ ہوگی جو صحیح حدیث میں وارد ہے جس کو منذری رحمہ نے کتاب الترغیب
والترہیب میں نقل کیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

لا یبلغ العبد صریح الایمان حتی یدع المزاح والکذب

یعنی خالص ایمان تک آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک مزاح یعنی ٹھٹھہ دل لگی اور جھوٹ کو نہ چھوڑ دے انتہیٰ۔

الوسواس

(الوسواس) اس لفظ کے معنی وسوسہ انداز کے۔ لئے جاتے ہیں۔ دراصل "وسواس" بالفتح اسم ہے۔ اور بالکسر مصدر۔ وسوسہ خفی آواز کو کہتے ہیں جو ہوا کی سنی جاتی ہے۔ اور زیور کی آواز کو بھی کہتے ہیں۔ ہر چند وسوسہ دل میں ہوتا ہے جہاں کسی قسم کی آواز کا وجود نہیں۔ مگر چونکہ وسوسہ میں باتیں ہوا کرتی ہیں اور باتوں کا تعلق آواز سے ہے اس لئے دل کی باتوں پر وسوسہ کا اطلاق کیا گیا ہے جس کے معنی خفی آواز کے ہیں اور وسوسے چونکہ پلٹ پلٹ کر دل میں آتے جاتے ہیں۔ اس لئے لفظ وسواس میں بھی تکرار ہوئی تا کہ تکرار لفظی تکرار معنوی پر دلالت کرے۔ اکثر استعمال اس لفظ کا بری باتوں میں ہوتا ہے جو دل میں آتی ہیں چنانچہ وسوسۂ شیطانی کہا جاتا ہے۔ چونکہ شیطان ہمیشہ وسوسے ڈالتا رہتا ہے اور کوئی دم ایسا نہیں گذرتا جس میں وہ وسوسہ نہ ڈالے۔ یا اس کی فکر میں نہ ہو۔ اس وجہ سے اس پر وسواس کا اطلاق فرمایا گیا۔ جیسے زیدٌ عدلٌ

کہا جاتا ہے۔ یعنی وسوسے ڈالتے ڈالتے وہ ہمہ تن وسوسہ ہی بن گیا چونکہ شیاطین کی تخلیق اسی واسطے ہے کہ اسباب شقاوت وضلالت قائم کیا کریں۔ اسی لئے وہ کبھی اس کام سے تھکتے نہیں۔ جس طرح فرشتوں کی تخلیق عبادت کے واسطے ہے جس کی وجہ سے وہ تھکتے نہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے۔

اب کہئے کہ وسوسہ انداز جو پیچھے پڑ گیا اور سوائے اس کے اُسے کوئی دوسرا کام ہی نہیں اُس کے شر سے بچنا کیسا مشکل کام ہے۔ نفس میں جتنے صفات رکھے گئے ہیں مثلاً شجاعت۔ جُبن۔ سخاوت۔ بخل صبر۔ بے صبری۔ حیا۔ بے حیائی۔ قناعت۔ حرص۔ تکبر۔ تواضع۔ رحم۔ جور وجفا وغیرہ۔

ان سب کے استعمال کے طریقے ایسے بتلاتا ہے کہ ذمیمہ تو ذمیمہ اخلاق حمیدہ بھی ذمیمہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً صفت سخاوت کسی میں ہو تو ایسے مصرف پیش کر دیتا ہے کہ مال تلف ہو جائے اور بجائے نام آوری کے بدنامی اور بجائے ثواب کے عذاب حاصل ہو۔ مثلاً عیاشی وغیرہ اور اگر ایسے کاموں سے نفرت ہو تو خیال نام آوری اور ریا وسمعہ عجب وغیرہ پیش کر دیتا ہے۔ جس سے سوائے اتلاف مال کے آخرت میں کچھ فائدہ نہ ہو۔

چونکہ نفس میں قوائے شہوانیہ و غضبیہ موجود ہیں۔ اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اپنی کل خواہشیں پوری کرے اور جتنی خواہشیں ہیں سب کو پوری کرنے کی اجازت بھی حق تعالیٰ نے دی ہے۔

مثلاً عورت کی خواہش ہو تو نکاح کی اجازت ہے۔ اسی طرح کل خواہشوں کا حال ہے۔ مگر شیطان جو آدمی کا دشمن ہے وہ نہیں چاہتا کہ حلال طریقہ سے خواہشیں پوری ہوں جس کی وجہ سے آدمی مستحق ثواب ہی ہو جائے بلکہ وہ مشورت دیتا ہے کہ ناجائز طریقہ سے پوری کی جائیں تاکہ بجائے اس کے کہ مستحق ثواب ہو۔ نافرمانی کے جرم میں مستحق عذاب بنا دے شیطان جس طرح بت پرستی پر لگاتا ہے ہوا پرستی پر بھی لگاتا ہے جو بت پرستی سے بھی بدتر ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما تحت ظل سماء من الٰہ یعبد من دون اللہ اعظم عند اللہ من ھوی متبع کذا فی کنز العمال یعنی فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آسمان کے نیچے اللہ تعالےٰ کے سوا جس معبود کی عبادت ہوتی ہے ان میں ہوائے متبع سے بدتر کوئی نہیں۔ ہوائے متبع کا مطلب یہ ہے کہ خدا و رسول کے خلاف حکم بھی کوئی خواہش ہو تو آدمی اُسی کا متبع رہے۔ اور حکم شرعی کا کچھ خیال نہ کرے۔ ہوا پرستی۔ بت پرستی سے بدتر ہونے کی وجہ ہے کہ بت پرستی بھی ہوا پرستی کا ایک شعبہ ہے۔

ب

جب حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ ہوا پرستی بت پرستی سے بدتر ہے تو مسلمانوں کو اپنی خواہشوں کے پورا کرنے میں کس قدر احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔

غرض کہ شیطان بذریعۂ ہوائے نفسانی آدمی کو تباہ کرکے اپنی خواہشیں پوری کرتا ہے۔

اگر وساوس شیطانی نہ ہوں تو آدمی نہ دنیا کی پریشانی میں پڑے نہ آخرت میں مصیبت بھگتے۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ شیطان ہمارا جانی دشمن ہے جیسا کہ خدائے تعالےٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کی عداوت اور اُس کی مکاریاں ظاہر کرکے مسلمانوں کو ہدایت فرما دی ہے کہ اس سے احتراز کرو اور اُس کا کہا نہ مانو اور اس کے کہنے کا طریقہ بھی معلوم کرا دیا کہ دل میں جو بیہودہ خیالات آتے ہیں وہ وساوس شیطانی ہیں تو اب آدمی کو لازم ہے کہ علم کے ذریعہ سے معلوم کرے۔

کنز العمال میں یہ حدیث وارد ہے کہ عن الاشعث بن قیس رضی اللہ

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشکرکم عند اللہ اشکرکم للناس یعنی فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑا شکر گزار اللہ کا تم میں وہی شخص ہے جو لوگوں کا شکر زیادہ کرے۔ مطلب یہ کہ اپنے محسن کا شکر کرنا گویا خدائے تعالےٰ کا شکر کرنا ہے۔ اگر محسن کا شکر زیادہ کروگے

تو گویا وہ شکر باری تعالیٰ کا ہو جاوے گا۔ کیونکہ محسن صرف واسطہ ہے جس کے ذریعہ سے خدائے تعالیٰ کی نعمت پہنچی ہے اگر وسائط بالکلیہ ساقط کردی جائیں تو خدائے تعالیٰ نے جو عالم اسباب میں مصلحتیں رکھی ہیں وہ فوت ہو جائینگی اور اُن کا فوت ہونا خدائے تعالیٰ کو منظور نہیں اسی وجہ سے حدیث شریف میں وارد ہے۔ کما فی کنز العمال۔ عن ابن عباس رضی قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من انعم علی اخیہ نعمۃ فلم یشکرھا فدعا علیہ یستجیب لہ یعنی جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کوئی نعمت عطا کرے اور وہ اس کا شکریہ نہ کرے اور محسن اس کی ناشکری کی وجہ سے اُس کے حق میں بد دعا کرے تو خدائے تعالیٰ اس کی بد دعا کو قبول فرمالیتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ احسان کا شکر نہ کرنا محسن کے دل کو دُکھانا ہے۔ اس دل آزاری کی سزا یہ مقرر ہوی کہ وہ جو کچھ بارگاہ کبریائی میں اس کی نسبت عرض کریگا وہ قبول ہو جائے گی اس سے ظاہر ہے کہ ہر چند انعام وعطا حق تعالےٰ کی جانب سے ہے مگر جن وسائط و ذرایع سے وہ نعمت حاصل ہوتی ہے وہ بھی قابل اعتبار نہیں۔ اگر وسائط نہ ہوں تو انتظام عالم درہم وبرہم ہو جائے گا۔ جس کا جی چاہے گا کسی پر ظلم کرکے کہدیگا کہ میں نے کیا کیا وہ تو خدائے تعالیٰ کا فعل تھا اور ہر شخص بحسب اقتضائے شہوات نفسانیہ

گناہوں کا مرتکب ہو کر کہے گا کہ میں بری الذمہ ہوں جو چاہا خدا نے کیا یہ درست ہے کہ بغیر مشیت الٰہی کوئی کام نہیں ہوتا مگر بُرا کام کرنے کے وقت آدمی کا مقصود صرف یہی ہوتا ہے کہ اپنی خواہش پوری کرے جس سے تلذذ خلاف امر الٰہی نفس کو حاصل ہو۔ اس مقصود کو پورا کرنے کے بعد اگر یہ چاہے کہ خدائے تعالےٰ پر الزام لگا کر آپ بری الذمہ ہو جائے۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ بُرا کام تو تم نے کیا اس میں فعل الٰہی کو کیا دخل؟ تو اس کا یہی جواب دیگا کہ یہ تو قرآن شریف سے ثابت ہے تو ہم کہیں گے کہ جس طرح قرآن شریف سے وہ ثابت ہے یہ بھی ثابت ہے کہ بُرے کاموں سے خدائے تعالےٰ نے منع فرمایا ہے اور اُس کی سزا مقرر فرمائی ہے۔ اگر قرآن شریف اس قابل ہے کہ اُس پر ایمان لایا جائے تو اس کے کل احکام پر ایمان لانا چاہیے۔ اس کے کیا معنی کہ اپنے مطلب کی آیتوں پر ایمان لا کر استدلال میں پیش کریں اور جن کا اثر نفسانی خواہشوں پر پڑتا ہے۔ اس کو نظرانداز کر دیں اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوائے آیات مشیت الٰہی کے دوسری آیات پر ایمان ہی نہیں جو شخص بعض آیات پر ایمان لائے اور بعض آیات پر ایمان نہ لائے تو اس کے شان میں حق تعالےٰ فرماتا ہے۔

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الاخزی فی الحیوٰة الدنیا ویوم القیامة

یردون الی اشد العذاب یعنی کیا تم بعض آیات پر ایمان لاتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے تو ایسے لوگوں کی جزا یہی ہے کہ دنیا میں رسوا ہوں اور آخرت میں سخت عذاب میں ڈالے جائیں۔

الحاصل ایمان کا مقتضےٰ یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے جو کچھ فرمایا ہے سب پر ایمان لائے اور یہ نہ کہیں کہ یہ بات فلاں آیت کے خلاف ہے بلکہ ایسے موقع میں یہ خیال کریں کہ ہر بات خدائے تعالےٰ کی قابل تسلیم ہے اگر اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہ ہو تو ہمیں اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہمارا کام بقدر استطاعت عمل کرنا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے

المؤمن کالجمل الانف حیثما انقید انقاد ۱۲ وکما قال صلی اللہ علیہ وسلم یعنی مسلمان کی مثل اُس اونٹ کی سی ہے جس کے نکیل لگی ہوئی ہو اس کا حال یہی ہے کہ جدھر کھینچیں ادھر مطیع و منقاد و فرماں بردار ہو کر چلا جاتا ہے۔ اگر یہ بات حاصل نہ ہو تو سمجھا جائے گا کہ وہ سرکش ہے پھر خدائے تعالےٰ کے مقابلے میں کس کی سرکشی چل سکتی ہے۔ الغرض مسئلۂ تقدیر و مشیت پیش کر کے گناہوں پر جرأت کرنا مسلمان کا کام نہیں۔ مروی ہے کہ شیطان نے بارگاہ کبریائی میں عرض کی کہ مجھ سے جو معصیت ہوئی وہ بحسب تقدیر تھی تو پھر یہ لعنت کیوں کی گئی ارشاد ہوا کہ تو نے جس وقت نافرمانی کی کیا جانتا تھا کہ وہ تقدیر میں ہے کہا نہیں ارشاد ہوا

کہ اسی کی سزا ہے جو تو ملعون ہوا۔

فی الحقیقت جس وقت اُس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اس وقت حسد اور تکبر اس پر اس قدر غالب تھا کہ تقدیر کا خیال بھی اس کو نہ آیا ہوگا۔ ورنہ صاف کہدیتا کہ الٰہی تو نے میری تقدیر میں مخالفت لکھی ہے اس لئے میں سجدہ نہیں کرتا بلکہ بجائے اس کے اس نے یہ کہا کہ میں ہرگز سجدہ نہ کرونگا۔ کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا جو لطیف ہے اور ان کو مٹی سے جو کثیف ہے اور لطیف کا کثیف کے روبرو سر جھکانا عقلاً خلاف وضع ہے۔

غرضکہ اپنی وضع داری اس وقت اس کے پیش نظر تھی۔ اسی طرح ہر گناہ کے وقت ایک خیال متمکن رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے آدمی مرتکب گناہ ہوتا ہے۔ اور بعد گناہ اگر تقدیر اور مشیت وغیرہ کے مسئلہ میں استدلال کرے تو وہی جواب ہوگا جو شیطان کو دیا گیا تھا۔

حق تعالے فرماتا ہے کہ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء یعنی خدائے تعالے سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علما ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہلا کو خدائے تعالے کا کچھ خوف نہیں۔ اس آیۂ شریفہ کی تصدیق کے بعد یہ یقین ہوتا ہے کہ جو لوگ تمامی درسی کتابیں پڑھ کر علما مشہور ہوتے ہیں اگر ان کو خوف خدا نہ ہو تو ان کو علما کہنا بے موقع ہوگا

ما بنا الیہ

کیونکہ کتابیں پڑھنا اور ہے اور علم کچھ اور چیز ہے۔ یورپ میں اکثر یہود و نصاریٰ علوم عربیہ میں ماہر ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے فاضل کہلاتے ہیں۔ مگر دین کی راہ سے ان کو علما نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح اہل اسلام بھی اگر تحصیل کر لیں اور ان میں خوف خدا نہ ہو تو اس آیۂ شریفہ کی رو سے انکو عالم کہنا درست نہ ہوگا۔ در اصل علم اس کیفیت قلبیہ کا نام ہے جو ظن سے متجاوز ہو کر حدّ یقین میں داخل ہو گئی ہو۔

اب یہاں یہ دیکھنا چاہیے کہ دین میں کونسی چیزوں کا علم معتبر ہے اور اس علم کا معلوم کیا ہے۔ کیونکہ عالم میں بے انتہا چیزیں ہیں جن کا علم دین کے لحاظ سے ضرور نہیں۔

تمام آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ آدمی کو خدائے تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے احکام و اخبار کا علم ضروری ہے۔ یعنی جس طرح خدائے تعالیٰ نے خبر دی ہے اس کا یقین کرلے اور کیفیت یقین حاصل ہو تو وہ علم ہوگا۔

جب آدمی اس بات کو جان لیگا کہ خدائے تعالیٰ کے صفات میں قہاریت بھی ایک صفت ہے اور اسی صفت کا یہ اثر ہے کہ حق تعالیٰ نے برے کاموں سے منع فرمایا۔ اور جو لوگ ان کے مرتکب ہوں ان کے لئے دوسرے عالم میں ایک بڑا قید خانہ تیار کیا جس میں ہر قسم کی اذیتیں ہیں

تو اس علم کے بعد اس سے گناہ اول تو صادر ہی نہ ہوگا اور اگر ہو گیا تو وہ توبہ کرلے گا۔

غرضکہ اس علم کے بعد اس کو خوف الٰہی ضرور ہوگا اور جس کو یہ علم ہی نہ ہو تو اس کو خوف بھی نہ ہوگا۔

الحاصل جس کسی کو صفت قہاریت اور اس کے آثار کا علم ہوگا ممکن نہیں کہ وہ بے خوف ہو البتہ مدارج علم متفاوت ہوتے ہیں۔ اس لئے خوف کے مدارج بھی متفاوت ہوں گے جس کو کمال درجہ کا علم و یقین ہوگا اس کو خوف بھی اسی درجہ کا ہوگا۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انا اخشاکم للہ یعنی میں تم سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ سے خوف و خشیت رکھتا ہوں۔

شفاء قاضی عیاض میں یہ روایت ہے کہ عبد اللہ بن سخیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ کے سینۂ مبارک سے ایسی آواز سنائی دیتی تھی جیسے دیگ کے جوش کی آواز ہوتی ہے۔

مطلب یہ کہ آپ گریہ کو ضبط فرماتے تھے مگر اندرونی اثر اس کا ظاہر ہو ہی جاتا تھا۔

شفاء میں ترمذی سے یہ روایت نقل کیا ہے کہ عن ابی ذر رضؓ قال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا وما تلذذتم بالنساء علی الفروش ولخرجتم الی الصعدات تجارون الی اللہ لوددت انی شجرۃ تعضد یعنی ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو میں جانتا ہوں اگر تم لوگ جانتے تو بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے اور بستروں پر عورتوں سے لذت حاصل نہ کرتے اور خدا کی طرف فریاد و فغاں کرتے ہوئے راستوں کی طرف نکل جاتے مجھے آرزو آتی ہے کہ کاش میں ایک درخت ہوتا جو جڑ سے اکھاڑ دیا جاتا چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نہایت ارفع ہے۔ اس لئے آخری جملہ یعنی لوددت انی شجرۃ تعضد کو محدثین نے ابوذر رضی اللہ عنہ کا کلام قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ فی الواقع یہی بات ہو مگر ظاہرا بلحاظ سیاق حدیث شریف ہی کا جزو معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی لفظ ایسا نہیں کہ جس سے معلوم ہو کہ وہ ابوذر رضی اللہ عنہ کا کلام ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہو تو بھی چنداں بعید نہیں اس لئے کہ حالت خوف جب دل پر طاری ہوتی ہے تو بیخودانہ ایسی باتیں نکل جاتی ہیں اور اس میں کوئی کسر شان بھی نہیں۔ کیونکہ جب دوسری قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس وقت اسی کے اقتضا کے موافق کلام صادر ہوتے ہیں۔

اہل تصوف جن پر بحسب مقامات حالات طاری ہوتے رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب کسی مقام سے متعلق کوئی حالت طاری ہوتی ہے اس وقت کسی بے احتیاطی ہوجاتی ہے یہی بے اختیاری اس حالت کے مناسب کلام پر مجبور کرتی ہے دوسرے احادیث کثرت سے وارد ہیں جس سے حضرت کی اصلی شان کا پتہ چلتا ہے کہ نہ وہ کسی نبی کو حاصل ہے نہ کسی فرشتہ کو اور اس حدیث میں گو ظاہر بینوں کی نظر میں کسر شان معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس میں بھی حضرت کی رفعت شان معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ مقام خوف بھی ایک اعلیٰ درجہ کا مقام ہے اور اس کا انتہائی درجہ عدم ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے۔ بہرحال مقام خوف کے آثار و لوازم اسی قسم کے ہوتے ہیں اور اسی پر منحصر نہیں ہر مقام کی بات جدا ہوتی ہے۔

جنگ بدر میں جب کفار کثرت سے باساز و سامان جنگ میں صف آرا ہوئے۔ اور صحابہ تھوڑے اور بے سامانی کی حالت میں یہ دیکھکر اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک حالت طاری تھی بار بار عرض کرتے تھے کہ الٰہی اگر ان مسلمانوں پر مشرک غالب ہوجائیں اور اس چھوٹی جماعت اہل ایمان کو تو ہلاک کردیگا تو روے زمین پر تیری عبادت موقوف ہوجائے گی یا اللہ مجھے رسوا مت فرمایا اللہ مجھ سے جو تونے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا کر حضرت قبلہ کی طرف متوجہ ہوکر ہاتھ اٹھا اٹھا کر بار بار اس قسم کی دعائیں

فرماتے تھے یہاں تک کہ چادر مبارک دوش مبارک پر سے گر گئی۔ ابوبکر رضہ نے چادر دوش مبارک پر اُٹھا کر کہا یا رسول اللہ بس کیجئے امید ہے کہ قریب میں حق تعالےٰ اپنا وعدہ پورا فرمائیگا۔ کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ صدیق اکبر رضہ کا ایمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یقین سے بڑھا ہوا تھا۔ اور معاذ اللہ حضرت کو یقین نہ تھا جس کی وجہ سے اس قسم کی دعائیں کرنے کی ضرورت ہوئی؟ ہرگز نہیں۔ کجا یقین صدیق اکبر رضہ اور کجا یقین سید المرسلین و باعث ایجاد کون ومکان۔ مگر بات یہ ہے کہ بڑوں کی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت مشاہدۂ ذات کبریائی تھا جو تمام عالم سے غنی ہے کما قال تعالےٰ واللہ غنی عن العالمین وہاں مسلمان تو کیا سارا عالم تباہ ہو جائے تو کچھ پرواہ نہیں اسی ذات پاک کا نام ہادی بھی ہے اور مضل بھی اسی مقام میں ارشاد ہے کہ اگر سارا عالم جنت میں چلا جائے تو کچھ پرواہ نہیں اور دوزخ میں جائے تو بھی کچھ پرواہ نہیں۔ بہرحال بارگاہ ربانی میں نہ جمال کو ترجیح ہے نہ جلال کو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مظہر شان جمالی تھے۔ اس وجہ سے آپ کو کمال درجہ کی تشویش تھی کہ کہیں شان جلالی کا ظہور نہ ہو جائے اور یہ تشویش یہاں تک بڑھی کہ گویا بیخودی کی حالت طاری کر دی۔

سیرۃ نبویہ میں شیخ دحلان رحمہ نے علما کا قول نقل کیا ہے کہ صدیق اکبر رضہ

مقام رجا میں تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقام خوف میں بہر حال
جس حالت کا پورا وجود ہوتا ہے۔ دوسرے کل خیالات مضمحل ہو جاتے ہیں
حق تعالیٰ فرماتا ہے حتی اذا استایئس الرسل وظنوا انھم
قد کذبوا جاءھم نصرنا یعنی یہاں تک (ڈھیل دی تھی) کہ رسول
بھی نا امید ہو چکے تھے اور خیال کرنے لگے تھے کہ اُن سے غلط وعدے
کئے گئے تھے تب اُن کے پاس ہماری مدد پہنچی۔

اس میں شک نہیں ہے کہ انبیا کو جو یقین اپنی نبوت کا اور وعدہ ہائے
الٰہی کے پورے ہونے کا ہوتا ہے۔ وہ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی وجہ سے زائل
ہو سکے مگر جب امداد ہی میں بہت تاخیر ہوئی اور یہانتک نوبت پہنچی کہ
شدہ شدہ یاس کی حالت طاری ہو گئی تو اُس وقت بمقتضائے بشریت
یہ خیال پیدا ہوا کہ وعدہائے امداد جھوٹے تو نہ تھے جو کسی واسطہ نے اپنی جانب
سے کہدیا۔

حالت یاس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ایسے خیالات پیدا ہوں کیونکہ جو حالت
آدمی پر غالب ہوتی ہے اس کے آثار کا ظہور میں آنا ضروری ہے دیکھئے
کسی قسم کی حالت کا جب غلبہ ہو جاتا ہے تو آدمی خودکشی کر لیتا ہے حالانکہ
مقتضائے فطرت انسانی یہ ہے کہ اپنی جان بچانے کی تدبیریں کرے
مگر غلبۂ حال اس مقتضائے فطرت پر بھی غالب آجاتا ہے۔ شرع شریف نے

بھی اس حالت کی رعایت رکھی ہے۔ چنانچہ حالت اضطرار میں مردار درست
ہو جاتا ہے۔ مگر اسی حد تک کہ وہ حالت ہو اسی وجہ سے چند لقموں کے
بعد جب وہ حالت باقی نہ رہے تو مردار جو ضرورتاً حلال ہو گیا تھا پھر مردار ہو جائیگا
یہیں سے قیاس ہو سکتا ہے کہ بزرگان دین پر جب سماع وغیرہ میں بھی حالت
وجد طاری ہوتی ہے تو بعض کلمات و حرکات ان سے ایسے صادر ہوتے ہیں
جو شرعاً و عقلاً ناجائز ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ بھی حالت ہوتی ہے اس لئے وہ
معذور سمجھے جاتے ہیں۔

الحاصل جب اسباب کسی حالت کے جمع ہو جائیں تو وہ حالت ضرور پیدا
ہو جائے گی۔ مثلاً خبر متواتر اور قرائن سے ثابت ہو جائے کہ فلاں مقام
میں شیر ہے اور شیر کا مقابلہ بھی ہو جائے تو حالت خوف ضروری طاری ہوگی
ہاں یہ بات اور ہے کہ جوان مرد شخص ہو اور اس کو اپنے اسلحہ اور قوت
ذاتی پر گھمنڈ ہو کہ شیر کو مار لونگا تو اس کو خوف نہ ہو گا۔ اور جب یہ خیال
ہو گا اس کے مقابلہ میں سر بر نہ ہو سکیگا تو ضرور خوف کرے گا۔

اب کہئے کہ کون ایسا ہو سکتا ہے کہ اپنی ذاتی قوت اور طاقت پر اسکو
اس درجہ گھمنڈ ہو کہ خدائے تعالےٰ کے مقابلہ میں سر بر ہو سکے۔ اسی وجہ
سے تمام انبیاء اور اولیاء جب خدائے تعالےٰ کی صفت قہاریت پر
نظر ڈالتے ہیں تو بے اختیار ان پر حالت خوف طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ

ان کا ایمان اس پر کامل ہوتا ہے ۔ پھر جب صفات کمالیہ ان کے پیش نظر ہو جاتے ہیں تو رجاء کی کیفیت ان پر طاری ہوتی ہے ۔
اسی وجہ سے علماء نے تصریح کی ہے کہ الایمان بین الخوف والرجاء درا صل کلام الٰہی بھی اسی کی تعلیم فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہے انہ لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون یعنی خدائے تعالےٰ کی رحمت سے نا امید ہونے والے سوائے کافروں کے اور کوئی نہیں ۔
اس سے ظاہر ہے کہ خدائے تعالےٰ کی رحمت کی امید رکھنا ضروری ہے اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے ۔
فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون یعنی خدائے تعالےٰ کے مکر سے بے فکر ہو جانے والے نقصان اٹھانے والوں کے سوا اور کوئی نہیں جس سے ظاہر ہے کہ مکر الٰہی سے خوف رکھنا ضروری ہے ۔ کنز العمال میں روایت ہے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من زعم انہ فی الجنۃ فھو فی النار یعنی جو شخص کہے کہ میں جنتی ہوں تو سمجھ جاؤ کہ وہ دوزخی ہے وجہ اس کی یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کا ایمان آیہ شریف فلا یامن مکر اللہ پر نہیں ہے اور جس کا ایمان پورے قرآن شریف پر نہ ہو ۔ اس کا دوزخی ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہے افتؤمنون ببعض

الکتاب و تکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم
الاخزی فی الحیوٰۃ الدنیا و یوم القیٰمۃ یردون الی اشد
العذاب - یعنی تھوڑی آیتوں پر ایمان لاتے ہو اور تھوڑی پر نہیں ایمان
لاتے - ایسے لوگوں کی جزا یہی ہے کہ دنیا میں رسوا ہوں اور قیامت میں
سخت عذاب میں ڈالے جائیں -

اب اگر اس پر بھی کوئی کسی قسم کا خیال پیش نظر رکھکر یہ سمجھ بیٹھے کہ میں
جنتی ہوں جس کا لازمہ یہ ہے کہ خدائے تعالےٰ نے جن کاموں کے
کرنے کا حکم فرمایا ہے وہ نہ کریگا اور جن کاموں کے کرنے سے منع فرمایا
ہے وہ کیا کریگا تو اس پر یہ آیت صادق آجائے گی افمن اتخذ الٰہہ
ھواہ و اضلہ اللہ علی علم جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے
اپنی خواہش کو معبود بنالیا اور خدائے تعالےٰ نے باوجود اس کے علم کے
اس کو گمراہ کردیا خواہش کو معبود بنانے کی یہی صورت ہے کہ خدائے تعالیٰ
کے ارشاد پر عمل نہ کرکے اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے پھر ایسے
شخص کا ٹھکانا حسب اصول عقلیہ و شرعیہ دوزخ ہی نہ ہو تو کیا ہو -

الحاصل خواہشات نفسانی کے مطابق تصرفات کرتا ہے -

غرضکہ جس طرح خواہشات نفسانی میں اپنا تصرف کرتا ہے - اسی طرح
تمام اخلاق حمیدہ و ذمیمہ میں اسی قسم کے تصرف کرتا ہے جس کا حال

کتب اخلاق میں مصرح ہے۔ احیاء العلوم کی کتاب الغرور یا اُس کا ترجمہ
مذاق العارفین دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ کیسے کیسے شیطان کے وسوسے
ہیں جن میں وسوسوں کے ذریعہ سے کامیاب ہوتا ہے۔ اسی طرح جسمانی
لذتوں سے متعلق وسوسے ڈالتا ہے۔ اور آنکھ۔ کان۔ ناک۔ منہ
ہاتھ۔ پاؤں۔ وغیرہ سے بری کام کراکر چھوڑتا ہے۔ اگر اس بیان کی
تفصیل لکھی جائے تو ایک بڑی کتاب ہو جائے گی۔ مگر بمصداق
العاقل تکفیه الاشارۃ کے یہ اجمال بھی کافی ہو سکتا ہے۔
بشرطیکہ ہر ایک امر میں غور و فکر سے کام لیا جائے۔ غرضکہ وساوس شیطانی
بے انتہا ہیں۔ بغیر خدائے تعالیٰ کی پناہ کے ممکن نہیں کہ آدمی اُس کے
شر سے بچ سکے۔ جو لوگ پناہ میں پوری طور سے آکر شیطان کی وسوسہ
اندازی اور مکر و تزویر سے بمقتضائے بشریت گناہ کے مرتکب ہو بھی
جاتے تو ان کو گناہ کچھ ضرر نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ گناہ سے
جو لذت حاصل ہوئی وہ ایک نعمت الٰہی تھی۔ جس کی تخلیق میں سوائے
خدائے تعالیٰ کے کسی کو دخل نہیں۔ اگر بجائے لذت کے اُس میں
مصیبت ہوتی تو ممکن نہیں کہ اُس کا ارتکاب ہو سکتا۔ دیکھئے کیسے ہی
لذیذ کھانے مہیا ہوں۔ مثلاً اگر منہ میں چھالے پڑ جائیں تو بجائے لذت
اُن کے کھانے میں اذیت ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر ایک عضو جس میں

ماننا

جس کو لذت کا احساس ہوتا ہے اُس میں کوئی آفت آجائے تو جس کام سے التذاذ ہوتا ہے وہی کام اُس کے حق میں عذاب ہو جاتا ہے۔ غرضکہ لذت دینا خدائے تعالےٰ ہی کا کام ہے۔

اعلیٰ درجہ کا شکر

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ حق تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل کی کہ اے موسیٰ تم میرا ایسا شکر کرو جو شکر کرنے کا حق ہے۔ انہوں نے عرض کی یا اللہ کس کو یہ طاقت ہے کہ ایسا شکر ادا کرسکے۔ ارشاد ہوا اے موسیٰ جب تم سمجھ لوگے کہ نعمت میری طرف سے ہے تو یہی اعلیٰ درجہ کا شکر ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ جائز نہیں کہ گناہ کرکے آدمی اللہ تعالےٰ کا شکر کرے۔ مگر یہ اعتقاد رکھنا بھی ضرور تھا کہ جتنے افعال بندے سے صادر ہوتے ہیں سب کا خالق خدائے تعالےٰ ہے۔ بخلاف اس کے اگر یہ اعتقاد کرے کہ شیطان اس فعل کا خالق ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ شیطانی فعل تھا تو یہ اعتقاد حدِ کفر کو پہنچ جائے گا۔ پھر اس اعتقاد کے موافق جب اُس فعل میں خدائے تعالےٰ کے خالق ہونے کا خیال کیا جائے تو بحسب شرع شریف اُس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس فعل سے خدائے تعالےٰ نے منع فرمایا ہے۔ اور اُس کا مرتکب مستحق عقاب ہے۔ کیونکہ خلق افعال۔ اور ارتکاب افعال میں بیّن فرق ہے۔ اس کا تعلق خدائے تعالےٰ سے ہے۔ اور

خلق افعال اور ارتکاب افعال

اس کا تعلق

اُس کا تعلق بندے سے ہے۔ اُس کا حسن اِس وجہ سے ہے کہ وہ فعل خاص
خدائے تعالے کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور قبح اس وجہ سے کہ خدائے تعالے
نے اُس کے ارتکاب سے منع فرمایا ہے۔ خدائے تعالے نے جس چیز کو
پیدا کیا خواہ وہ اچھی سمجھی جائے یا بُری۔ اُس کا پیدا کرنا بُرا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ
یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو خدائے تعالے نے پیدا کیا وہ بری نہیں ہو سکتی
کیونکہ برائی اور بھلائی باعتبار آثار و لوازم کے ہوا کرتی ہے۔ نفس شئے کو
اُس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے کہ یہ امور اُس کی ذات سے خارج
ہیں۔ دیکھئے آگ مثلاً جو خدائے تعالے کی مخلوق ہے اُس کو نہ بری
کہنے کی ضرورت ہے نہ اچھے کہنے کی بلکہ صرف وہ آگ ہے۔ اُس کے
بعد اگر وہ کسی کو جلا دے تو وہ ضرور کہے گا کہ کیا ہی بُری چیز ہے۔ اور اگر
کھانا پکا دے تو اسے اعلےٰ درجے کی نعمت سمجھے گا۔ اسی پر تمام چیزوں کو
قیاس کر لیجئے۔ سانپ اس وجہ سے بُرا سمجھا جاتا ہے کہ آدمی اُس کے
زہر سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ جذامی کو کاٹے تو اُس کو
صحت ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں جذامی اُس کا عاشق ہوگا۔ اور تلاش
کر کے اُس سے ملنا چاہے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی چیز فی حد ذاتہ بُری
نہیں۔ بلکہ موجود ہونے کی حیثیت سے اچھی ہے۔ اگر کوئی بُری چیز ہے تو
عدم ہے۔ یہ اشیاء کا حال تھا۔ اسی طرح افعال کا حال بھی ہے کہ موجود

ہونے کی حیثیت سے کل افعال اچھے ہیں۔ اور نیز اس وجہ سے کہ خاص خدائے تعالے کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ جس کی حکمت کا یہ مقتضے نہیں ہوسکتا کہ دیدہ و دانستہ بُری چیز کو پیدا کرے۔ غرضکہ فعل بھی فی نفسہ ایک موجود چیز ہے۔ جس کی بُرائی یا بھلائی باعتبار آثار ولوازم کے ہوگی جتنے بُرے کام ہیں چونکہ اُن کے لوازم بُرے ہیں۔ اس وجہ سے وہ بُرے ہیں۔ ورنہ اُن کو بُرے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بسا وقت اچھے کام بھی کسی وجہ سے بُرے ہوجاتے ہیں۔ اور بُرے کام اچھے۔ مثلاً کثرت عبادت سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ مگر ریا وغیرہ کی وجہ سے وہ بری ہوجاتی ہے ؎

کلید درِ دوزخ است آں نماز
کہ از بہر مردم گذاری دراز

لیجئے نماز جو باعث دخولِ جنت ہے وہ دوزخ کی کنجی ہوی جارہی ہے

حضرت عمرؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلے تھے۔ اُن کا اس ارادے سے راہ طے کرنا کیسا فعل تھا۔ نبی کے قتل سے بدتر کوئی فعل نہیں ہوسکتا۔ مگر جب اُس فعل کے ذریعہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچکر مشرف باسلام ہوئے تو ایسے فعل کو جو ابدالآباد تک فضیلت کا باعث ہو اگر تمام اعمال حسنہ سے اچھا کہا جائے تو

بے موقع نہ ہوگا۔ دیکھئے یہ ایک ہی فعل ہے۔ یعنی چل کر راہ طے کرنا ایک اعتبار سے بدترین افعال تھا۔ اور ایک اعتبار سے بہترین افعال ہوا۔ غرضکہ نفس فعل نہ برا ہے نہ اچھا۔ بلکہ باعتبار وجود کے اُس کو اچھا بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ افعال میں برائی اور بھلائی بحسب اعتبارات ہے تو اس اعتبار سے کہ آدمی کو جس فعل میں تلذذ ہوا اُسے نعمت کہنے میں کوئی تامل نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ شرعاً ممنوع ہونے کی وجہ سے اُس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ اس اعتبار سے اُس کو بُرا کہنا بھی ضرور ہے۔ مگر ارتکاب کے وقت اُس میں وہ بُرائی موجود نہیں جو آئندہ جزا کے وقت ہونے والی ہے اس لحاظ سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ فعل تو تلذذ کی وجہ سے نعمت تھا مگر اُس کی جزا بری ہے۔ جس سے اذیت حاصل ہوگی۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ فعل فی نفسہ اچھا۔ بلکہ ایک نعمت تھی۔ جو مستوجب شکر ہے۔ اگر مدارج میں خلط نہ کیا جائے تو نفس فعل قابل شکر ہے۔ اور اس کی جزا قابل اجتناب۔ جو لوگ پناہ الٰہی میں آجاتے ہیں اگر اُن سے کوئی گناہ صادر ہو جاتا ہے تو اس لحاظ سے کہ نعمت ہے شکر الٰہی دل سے بجا لاتے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ بے شک ہم سے گناہ صادر ہوا۔ جس کا

انجام بُرا ہے۔ اور اُس کے شر سے پناہ مانگتے ہیں۔ چنانچہ یہی بات سید الاستغفار سے ظاہر ہے جس کے یہ الفاظ صحیح احادیث میں وارد ہیں۔ اللّٰھُمّ انت ربي لا الٰہ الا انت خلقتنی و انا عبدك و انا علے عهدك ووعدك ما استطعت اعوذبك من شر ما صنعت ابوءُ لك بنعمتك عليّ وابوءُ بذنبي فاغفرلي فانه لا يغفر الذنوب الا انت یعنی یا اللہ تو میرا رب ہے کوئی معبود تیرے سوا نہیں۔ تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں۔ اور میں تیرے عہد اور وعدہ پر قائم ہوں جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے۔ جو برا کام میں نے کیا اُس کے شر سے میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔ اور میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھ پر تیری نعمت ہے اور اپنے گناہ کا بھی اقرار کرتا ہوں۔ تو خدایا مجھے بخشدے۔ کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو نہیں بخشتا انتہی۔

سید الاستغفار کے معنی

دیکھئے نعمت کا اقرار کرنا اعلیٰ درجہ کا شکر ہے۔ جب کہ حدیث شریف سے ابھی معلوم ہوا۔ اور اس موقع میں سوا اُس تلذذِ گناہ کے اور کونسی نعمت تھی۔ پھر اُس کے ساتھ ہی گناہ کا اقرار بھی ہو گیا۔ اور اس کے شر سے پناہ بھی مانگی گئی۔ یہ بات معلوم ہے کہ آدمی کا نفس ہمیشہ اپنی خواہشوں کو پوری کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ خواہ

جائز طریقہ سے ہو یا ناجائز اور شیطان ناجائز طریقوں سے پورے کرنے کی تدبیریں بتاتا ہے۔ جب اس قسم کی بات آدمی کو معلوم ہو جاتی ہے تو شیطان کو گناہوں پر جرأت دلانے کا موقع مل جاتا ہے۔ کہ جب وہ خدائے تعالےٰ کی طرف سے نعمت ہے تو نہایت شکر گذاری سے اُس کو حاصل کرنا چاہئیے۔ اس قسم کے دھوکہ میں وہی شخص آجاتا ہے جس کا ایمان ضعیف ہو۔ یا برائے نام مسلمانوں میں شریک ہے۔ کامل الایمان ایسے وسوسوں پہ لاحول پڑھتا ہے۔ کیونکہ وہ یقیناً جانتا ہے کہ خدائے تعالےٰ گناہوں سے ناراض ہے اور اُن کی سزائیں مقرر کی ہیں اسی وجہ سے گناہ اتفاقاً صادر ہو جائے تو نہایت عجز و الحاح سے بارگاہ کبریائی میں عرض کرتا ہے کہ آلٰہی میں اقرار کرتا ہوں کہ گناہ مجھ سے صادر ہو گیا۔ اب تیرے سوا کوئی اُس کو بخشنے والا نہیں اُس کے شر سے میں تیری پناہ میں آتا ہوں اُس کو بخشدے۔ اگر ایسا نہ کرے تو گناہوں کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور دل سیاہ اور زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کنز العمال میں روایت ہے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہّ ہو جاتا ہے اگر اُس کو اس نے چھوڑ دیا اور استغفار اور توبہ کی تو دل کی صیقل ہو جاتی ہے۔ اور اگر پھر کیا تو وہ دھبّہ بڑھ جاتا ہے اور اُس کے دل کو گھیر لیتا ہے۔ اسی کا نام ران ہے جسکو

خدائے تعالےٰ نے ذکر فرمایا ہے۔ کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔

الخنّاس

(الخنّاس) ہٹنے اور چھپنے والا۔

خناس

احادیث میں وارد ہے کہ شیطان اپنی چونچ آدمی کے دل پر رکھکر وسوسے ڈالتا ہے۔ اور جب وہ خدائے تعالےٰ کا ذکر کرنے لگتا ہے تو وہ ہٹ جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جس دل میں یاد الٰہی ہو شیطان کا اُس پر تسلط نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے اولیاء اللہ گناہوں سے محفوظ ہیں۔ اور انبیاء معصوم کیونکہ اُن حضرات کے دل میں ہر وقت یاد الٰہی رہتی ہے یہاں تک کہ دنیوی کاموں میں بھی اُن کو غفلت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم نے مقاصد الاسلام کے کسی حصہ میں اُس کو بتفصیل بیان کیا ہے کہ ہر کام میں ایک خاص قسم کا وہ ذکر کیا کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ لوگو ڈرتے رہو۔ اور شیطان سے بچو۔ کیونکہ وہ تم کو آزماتا ہے کہ تم میں کون شخص عمل میں اچھا ہے۔ انتہیٰ۔

شیطان سے ذکر بچاتا ہے

مقصود اس سے یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے شیطان سے فرمایا ہے کہ ان عبادی لیس لک علیہم سلطان ۔ یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا جب وہ وسوسے ڈالنے کا موقع نہیں پاتا یا وسوسے ڈالتا ہے مگر اُس کی کچھ چلتی نہیں تو سمجھ جاتا ہے کہ یہ اُنہیں لوگوں میں ہیں جن پر اپنا تسلط نہیں اُس وقت دوسری تدابیر میں مصروف ہوتا ہے چنانچہ حضرت غوث الثقلین رح کے حال میں لکھا ہے کہ آپ نے اوائل میں بڑے بڑے مجاہدے فرمائے ۔ ایک رات ذکر الٰہی میں مشغول تھے کہ یکبارگی آسمان پر روشنی نمایاں ہوئی جس سے آفاق روشن ہو گئے آپ متحیر ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے غیب سے آواز آئی کہ اے عبد القادر تم نے بہت عبادت کی ۔ اُس کے معاوضہ میں ہم تمہیں یہ بدلا دیتے ہیں کہ جن چیزوں کو اوروں پر حرام کیا ہے تم پر حلال کر دیا یہ سنتے ہی آپ نے لاحول پڑھی ۔ اس کے ساتھ ہی وہ روشنی مبدل بتاریکی ہو گئی اور آواز آئی کہ اے عبد القادر میں نے بہت سے لوگوں کو جو اس درجہ پر پہنچے تھے گمراہ کر دیا ۔ مگر آپ علم کی وجہ سے بچ گئے ۔ یہ ایک بیرونی تدبیر تھی ۔ غرضکہ شیطان بیرونی اور اندرونی تدابیر ہمیشہ کرتا اور موقع بے موقع آزماتا رہتا ہے ۔ اور آخری آزمائش اُس کی موت کے قریب ہوتی ہے جس میں پورا کافر بنانے کی فکر کرتا ہے ۔ چنانچہ حق تعالےٰ

فرماتا ہے اذ قال الشیطان للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریٓئ منک انی اخاف اللہ رب العالمین یعنی جب کہتا ہے کہ شیطان انسان کو کہ کافر ہو جا۔ اگر وہ کافر ہو گیا تو کہتا ہے میں تجھ سے بری ہوں۔ میں خدائے رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

آکام المرجان فی احکام الجان میں ایک روایت نقل کی ہے کہ جب مسلمان شیطان کے فتنوں سے بچکر حالت ایمانی پر مرتا ہے تو شیطان کو نہایت غم ہوتا ہے۔ اور اس طرح روتا ہے کہ کوئی گھر والوں کے مرنے پر بھی ایسا نہیں روتا۔ اور اُسی میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل رح نے موت کے قریب لا بعد لا بعد کہا جب انہیں افاقہ ہوا تو ان کے فرزند صالح نے پوچھا کہ آپنے لا بعد لا بعد جو فرمایا وہ کیا بات تھی۔ فرمایا کہ شیطان نے میرے سر کے پاس آکر مجھ سے کہا کہ اے احمد میں کچھ پوچھتا ہوں۔ فتویٰ دیجئے۔ میں نے لا بعد لا بعد کہا یعنی اس وقت نہیں بعد دیکھا جائے گا۔ معلوم نہیں کہ کس قسم کا سوال اُس نے سوچ رکھا تھا۔ جس سے ایسے جلیل القدر امام کے ایمان کو سلب کرنے کی فکر تھی۔ اور اسی میں ابوداؤد کی حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے اعوذ بك ان یتخبّطنی الشیطان عند الموت یعنی یا اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ

موت کے قریب شیطان مجھے مخبوط بنا دے انتہیٰ۔

اگرچہ یہ دعا امت کی تعلیم کے واسطے تھی۔ مگر اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیطان موت کے قریب اپنا پورا زور لگاتا ہے۔ اور اسی میں صالح بن احمد ابن حنبل سے ایک روایت منقول ہے کہ جب فرشتے مسلمان کی روح آسمان پر لے جاتے ہیں تو وہاں کے فرشتے تعجب کر کے کہتے ہیں کہ اس شخص نے شیطان کے ہاتھ سے کس طرح نجات پائی۔

ابن جوزی رح نے تعجب کی وجہ لکھی ہے کہ شیطان کے فتنے کثرت سے ہیں۔ اور دل کے پاس اُس کا مقام ہے۔ اور وہ ایسے ہی چیزوں کی طرف لے جاتا ہے جو آدمی کی خواہش کے مطابق ہوں اور نفسانی خواہشیں ایسی بلا ہیں کہ ہاروت و ماروت جو فرشتے تھے جب خواہشیں انہیں دی گئیں تو وہ اپنے کو بچا نہ سکے تو انسان کس طرح اپنے آپ کو مکر شیطان سے بچا سکتا ہے۔ ان امور کے لحاظ سے فرشتے تعجب کرتے ہیں کہ کس طرح اس نے اپنے آپ کو شیطان سے بچایا ہو گا۔ انتہیٰ۔

اب غور کیجئے کہ ایمان دار کو شیطان کے فتنوں سے کس قدر ڈرنا اور ہمیشہ پناہ مانگنا چاہیئے۔

یہاں یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ شیطان کی صرف وسوسہ اندازی سے کوئی نقصان نہیں۔ اس لئے کہ وہ شیطان کا فعل ہے۔ اُس کی جزا وہی

بھٹکنے لگا۔ صرف اُس وسوسے کے دل میں پیدا ہونے سے یہ نہیں کہا
جاسکتا کہ دل نجس یا خراب ہوگیا۔ کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ کوئی چیز اپنی ذات
سے بُری نہیں۔ اگر فرض کیا جائے کہ عمر بھر بُرا وسوسہ دل میں رہے۔ اور
آدمی اُس کو اچھا یا بُرا نہ سمجھے تو اُس سے کوئی نقصان نہیں۔ ہاں اگر اُس
بُرے وسوسے کو اچھا سمجھے تو یہ سمجھنا جو اس کا فعل ہے قابل مؤاخذہ ہوگا۔
اور بُرا سمجھے تو وہ قابل تحسین ہوگا۔ چنانچہ صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے اس امر کی شکایت کی کہ بعض وقت بُرے خطرات دل میں آتے ہیں
جن کا بیان ناگوار ہوتا ہے۔ فرمایا کیا تم ان کو بُرے سمجھتے ہو۔ عرض کیا جی ہاں
فرمایا یہی تو ایمان ہے۔ انتہٰی۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر ایمان نہ ہوتا تو اس کو بُرا کیوں سمجھتا۔ بے ایمان
تو بُرے خطروں کو پرورش کرکے اُن سے کام لیتا ہے۔ غرضکہ نفس خطرہ
اور وسوسہ بُرا نہیں۔ اس وقت تک کہ بُرے وسوسے کو اچھا نہ سمجھے۔ یا ایسا
عمل نہ کرے۔ جب وسوسۂ شیطانی دل میں پیدا ہو۔ اور آدمی یہ خیال کرے
کہ اس کا خالق خدائے تعالےٰ ہے اس میں میرے فعل کو کوئی دخل نہیں،
کیونکہ ہر اختیاری کام میں پہلے اُس کا علم اور ارادہ ضرور ہوا کرتا ہے۔ اور
اس خطرے کے وقت نہ اُس کا علم اور ادراک تھا نہ اُس کی جانب ارادہ
مبذول ہوا۔ جس سے ظاہر ہے کہ ہمارے فعل کو اُس میں کوئی دخل نہیں تو

یہی خیال باعث تقرب الٰہی ہوگا۔ کیونکہ جب تک اس خیال میں وہ مصروف ہے خدائے تعالےٰ کا ذکر اور مشاہدہ صفات الٰہیہ ہے اور بمصداق حدیث شریف انا جلیس من ذکرنی کے حق تعالیٰ کے ساتھ اُسکو مجالست حاصل ہے۔ اور بمصداق آیہ شریفہ فاذکرونی اذکرکم وہ اس درجہ میں ہے کہ خدائے تعالےٰ اُس کا ذکر فرمارہا ہے۔ دیکھئے وہ وسوسۂ شیطانی کس قدر باعث تقرب الٰہی ہوگیا۔ مگر یہ بات ہر شخص کو حاصل ہونا مشکل ہے۔ ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں شیطان نے وسوسہ ڈال کر بُرے کام کی طرف توجہ دلائی اُس کام کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور نفس ناطقہ کو اپنی خواہش پوری کرنے کی فکر ہوگئی۔ اگر کوئی مانع نہ ہو تو اس کو پوری کربھی لیا۔ جس طرح دیوانوں کا حال ہوتا ہے کہ جب اُن کے دل میں کسی کو مارنے کا وسوسہ اور خیال مثلاً آجاتا ہے تو بلا تامل مار دیتے ہیں۔ بخلاف عقلا کے کہ وہ اس خیال میں غور و تامل کرتے ہیں پھر جس قدر عقل زیادہ ہوگی۔ غور و فکر زیادہ ہوگی۔ اعلیٰ درجے کا عاقل وہ سمجھا جائیگا کہ اس امر پر غور کرے کہ وہ خیال کیوں پیدا ہوا۔ اور اس کا منشا کیا ہے۔ اور اُس کے موافق عمل کیا جائے تو اس سے کس قسم کی خرابیاں پیدا ہونگی۔ غرضکہ جو عقلا ہیں وہ سب سے پہلے یہ خیال کرتے ہیں کہ اس خیال کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ جب اُن کو ایمانی نظر

سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے خدائے تعالےٰ کے کوئی اُس کا خالق نہیں
تو اُس کے نتائج پر غور کرتے ہیں کہ آیا وہ فعل جس سے وسوسہ متعلق ہے
باعث خوشنودی الٰہی ہے یا باعث غضب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ باعث
خوشنودی الٰہی ہے تو فوراً اس وسوسہ کے مطابق کام کر لیتے ہیں۔ اور اس
وسوسہ کو اس حدیث شریف کے موافق اچھا سمجھتے ہیں جو تفسیر درمنثور میں مروی
ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے اللھم اعمر قلبی
من وساوس ذکرك واطرد عنی وساوس الشیطان۔
یعنی یا اللہ میرے دل کو تیری ذکر کے وسواس سے آباد رکھ۔ اور شیطان
کے وسواس مجھ سے دور کر۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ وہ وسوسہ باعث غضب
الٰہی ہے تو خشیت اور خشوع اُن پر طاری ہوتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ
صفت اضلال کا ظہور ہو رہا ہے اور واسطہ اس میں شیطان ہے۔ کیونکہ
ہدایت کرنا اور گمراہ کرنا دونوں خدائے تعالےٰ ہی کے کام ہیں۔ چنانچہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نہ مجھے ہدایت میں دخل ہے نہ
شیطان کو گمراہی میں۔ یعنی دونوں خدا ہی کے کام ہیں چنانچہ قرآن شریف
میں وارد ہے یضل من یشاء ویھدی من یشاء یعنی جسکو وہ چاہتا
ہے گمراہ کرتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اور ارشاد ہے
ومن یضلل فلا ھادی لہ جب یہ خیال متمکن ہوتا ہے کہ اب خدائے تعالےٰ

گمراہ کرنا چاہتا ہے تو کمال عجز و انکسار سے وہ دعائیں اور عرض و معروض شروع کرتے ہیں۔ جس کی تعلیم حق تعالیٰ نے دی ہے۔ مثلاً ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔ یعنی اے رب ہمارے دلوں میں کجی نہ ڈال بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت کرکے اسلام کی سیدھی راہ دکھلا دی اس کے سوا اور دعائیں جن کی تعلیم دی گئی ہے کمال تضرع و زاری سے کرنے لگتے ہیں۔ جس سے رحمت الٰہی جوش میں آکر اس وسوسہ کو بے اثر کر دیتی ہے اور شیطان حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے کہ کرنا کیا چاہتا تھا اور ہوگیا کیا۔ اور اگر بمقتضائے بشریت گناہ صادر ہوگیا تو ان کو حزن و ندامت ہوتی ہے اور توبہ کرتے ہیں یعنی خدائے تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کہ الٰہی گناہ صادر تو ہوگیا اور اس کی سزا کا مستحق بھی ہوں۔ مگر اپنے فضل سے تو معاف فرما دے تو تیری عام رحمت سے کچھ بعید نہیں۔ تو غفار ہے۔ ستار ہے۔

کنز العمال میں یہ روایت ہے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بندہ گناہ کرتا ہے۔ پھر جب وہ گناہ اسے یاد آئے اور اس فعل پر غم ہو تو خدا تعالیٰ اس کے دل کو دیکھتا ہے اس کی حالت غم کو دیکھ کر وہ گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ غرضکہ صدق دل سے وہ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرکے گناہ کو

معاف کرا لیتے ہیں اور وہ اُس شخص کے مثل ہو جاتا ہے جس نے کیا ہی نہیں جیسا کہ صحیح حدیث شریف میں وارد ہے۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب له

ترغیب وترہیب میں بخاری اور مسلم وغیرہ سے منذری رحمہ نے نقل کیا ہے کہ فرمایا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے تو خدائے تعالےٰ کو اُس مسافر سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جو اپنا کھانا پانی وغیرہ حوائج اونٹ پر رکھکر جا رہا ہو۔ کسی جنگل میں اونٹ سے اتر کر سو رہا جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ اونٹ غائب ہے۔ اُس کی تلاش میں نکلا۔ اور بہت پریشان ادھر اُدھر پھرا۔ مگر کہیں اُس کا پتہ نہ پایا۔ جب دھوپ سخت ہوئی۔ اور بھوک اور پیاس غالب اور موت آنکھوں میں پھر گئی تو کہا کہ چلو اسی مقام پر جاکر مر جائیں۔ جہاں سے اونٹ چلا گیا۔ اور اس مقام میں آکر سو رہا۔ جب آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹ کھڑا ہے اور توشہ پانی وغیرہ محفوظ ہے۔ یہ دیکھ کر مارے خوشی کے کہنے لگا یا اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ کمال خوشی میں اسے یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ کیا کہہ رہا ہے انتہیٰ۔

اب غور کیجئے کہ اُس حالت مایوسی میں کس قدر خوشی ہونی چاہئیے۔ اُس کا صحیح اندازہ آرام سے گھر میں بیٹھنے والے نہیں کر سکتے۔ مگر اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ خوشی کا کوئی درجہ نہ ہوگا۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے تو حق تعالےٰ کو اُس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جو شخص مذکور کو ہوئی۔ یہ شان اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ کے توبہ کا نفع تو بندہ کو ہو۔ اور ابدالآباد بے انتہا نعمتوں میں خوش رہے۔ اور خوشی خدائے تعالےٰ کو ہو۔

اسی کی تائید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے۔ جو کنز العمال میں ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا لو لم تذنبوا لذھب اللہ بکم الحدیث" جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدائے تعالےٰ تم کو فنا کر کے ایک ایسی قوم پیدا کرتا جو وہ گناہ کرتی اور خدائے تعالےٰ سے مغفرت مانگتی۔ اور وہ اُس کو بخش دیتا۔ انتہٰی۔

اس سے مقصود یہ نہیں کہ آدمی گناہ کیا کرے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ صحابہؓ سے جب کبھی گناہ سرزد ہوتا تو مارے خوف کے زندگی اُن پر وبال ہو جاتی تھی اس کی تصدیق ماعزؓ کے واقعہ سے ہوتی ہے۔ جو کتب احادیث میں مذکور ہے کہ اُن سے زنا وقوع میں آیا۔ ساتھ ہی وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اور عرض کی یا رسول اللہ میں نے زنا کیا۔ مجھ پر حد جاری فرمائیے حضرت نے بہت کچھ اعماض فرمایا اور ٹالا۔ مگر وہ نہ مانے۔ چنانچہ رجم کا حکم دیا گیا۔ جس سے وہ شہید ہو گئے۔

جب صحابہ کو گناہ سے اس درجہ خوف تھا کہ زندگی اُن پر وبال ہو جاتی تھی

تو ان کی تسکین کے لئے ارشاد ہوا کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدائے تعالے ایسی قوم کو پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور توبہ کرتی مقصود یہ کہ اگر گناہ ہو جائے تو توبہ کرلینا کافی ہے۔

الحاصل حدیث موصوف سے یہ ثابت ہے کہ خدائے تعالے کو یہ امر نہایت مرغوب ہے کہ گناہ گار توبہ کرے اور وہ اُس کو بخشدے۔ چونکہ حق تعالے ارحم الرّاحمین ہے اور صفت رحمت اُس میں بڑی ہوئی ہے۔ اور مغفرت رحمت کا ایک شعبہ ہے۔ اس لئے توبہ کو نہایت دوست رکھتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ ان اللّٰہ یحب التوابین تاکہ توبہ کے بعد مغفرت فرماوے۔ اور توبہ بغیر گناہ کے نہیں ہوسکتی تھی اس لئے یہ اہتمام ہوا کہ ایک اغوا دینے والا پیدا کیا گیا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔ جو کنز العمال میں مذکور ہے۔ کہ اگر خدائے تعالے کو یہ منظور ہوتا کہ کوئی اُس کی معصیت نہ کرے تو ابلیس کو نہ پیدا کرتا۔ انتہیٰ۔

جب توبہ سے خدائے تعالے کو نہایت خوشی ہوتی ہے۔ تو ہر مسلمان کو چاہیئے کہ توبہ کرے۔ کنز العمال میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے لوگو توبہ کرو۔ خدا کی قسم میں ہر روز سو بار توبہ کیا کرتا ہوں۔ انتہیٰ۔

اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو توبہ کی کوئی ضرورت

نہ تھی۔ کیونکہ آپ سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوا۔ مگر باوجود اس کے آپ توبہ
کرتے تھے۔ اس وجہ سے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین
یعنی نیک لوگوں کے حسنات مقربین کے گناہ ہیں کیونکہ مقربین کے
شان کے گناہ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ہمیں وہ نصیب ہو جائیں تو
ہماری نجات ہو جائے۔ بہر حال حضرت کا توبہ کرنا ثابت ہے۔ تو اب
مشائخین اور پیروں کو کس قدر توبہ کی ضرورت ہوگی۔ یہاں تو علانیہ وہ
گناہ ہیں جس کو ظاہر شریعت نے گناہ قرار دیا ہے۔ یوں تو ہر بندہ کا فرض
ہے کہ اپنے خالق کو خوش کرے۔ مگر جن لوگوں کو محبت الٰہی کا دعوے ہے
اور زمرۂ اہل اسلام میں اسی خصوصیت سے سرآمد اور وہ سمجھے جاتے ہیں
جس کی وجہ سے لوگ ان کی تعظیم و توقیر کرتے ہیں وہ بہ نسبت مریدین کے
زیادہ اس امر کے مستحق ہیں کہ گناہوں سے توبہ کرکے اپنے محبوب کو خوش
کریں۔ اگر یہی حضرات ایسے کاموں میں مبتلا ہوں جن کو خدائے تعالےٰ
اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ قرار دیا اور صاف ارشاد ہوا کہ ایسے
کام کرنے والوں سے خدائے تعالیٰ ناخوش ہے تو کہئے کہ کس قدر بے موقع
ہوگا۔ اور مریدین کو بھی ضرور ہے کہ خدائے تعالےٰ کو قبل سلوک خوش کریں
چنانچہ قوت القلوب وغیرہ کتب تصوف میں لکھا ہے کہ پیر کو
چاہیئے کہ مرید کو پہلے توبہ کرنے کا حکم کرے۔ مگر یہ یاد رہے کہ زبان سے

توبہ توبہ یا اتوب الی اللہ کہدینا کافی نہیں۔ بلکہ بزرگان دین کے
نزدیک یہ خود گناہ ہے۔ جیسا کہ قوت القلوب جو حضرات صوفیہ کے
نزدیک معتبر کتاب ہے اور بزرگان دین اس کے مطالعہ کی تاکید
فرمایا کرتے تھے اس میں لکھا ہے کہ بعض بزرگوں کا قول ہے کہ جب
میں استغفر اللہ زبان سے کہتا ہوں اور دل میں ندامت نہیں ہوتی
تو اُس سے استغفار کرتا ہوں۔ اور خدائے تعالےٰ سے مغفرت مانگتا
ہوں اور لکھا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ زبان سے استغفار کرنا
بغیر اس کے کہ دل میں ندامت ہو جھوٹوں کی توبہ ہے۔ اور رابعہ بصریؒ
کا قول نقل کیا ہے کہ ہمارا استغفار کرنا خود دوسرے استغفار کا محتاج ہے
اسی طرح توبہ اس کی محتاج ہے کہ اُس سے توبہ کی جائے انتہی۔

حضرت غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ غنیۃ الطالبین
میں لکھتے ہیں کہ توبہ ہر شخص کے لئے فرض عین ہے کوئی بشر اُس سے
مستغنی نہیں۔ کیونکہ وہ جوارح اور اعضا کے معصیتوں سے بچ نہیں سکتا
اور اگر اس سے بچ گیا تو دل کے گناہوں کے ارادہ سے بچ نہیں سکتا۔ اور اگر
اُس سے بچ گیا تو شیطان جو دل میں مختلف خطرے ڈالتا ہے جن کی
وجہ سے ذکر الٰہی سے غافل ہو جائے بچ نہیں سکتا۔ اور اگر اُس سے
بھی بچ جائے تو غفلت اور علم صفات و افعال الٰہی کے حاصل کرنے میں

قصور اور کوتاہی کرنے سے بچ نہیں سکتا۔ یہ تمام مومنین کے احوال اور مقامات ہیں۔ جن کے لئے طاعات اور گناہ۔ اور حدود اور شروط مقرر ہیں حفاظت ان کی طاعت ہے۔ اور ان کا چھوڑ دینا اور ان سے غفلت کرنا گناہ ہے۔ بہر حال ہر شخص کو ہر حالت میں توبہ کی ضرورت ہے مگر مقامات متفاوت ہیں۔ عوام کی توبہ گناہوں سے ہوگی اور خواص کی توبہ غفلت سے۔ اور خاص الخاص کی توبہ ماسوی اللہ کے طرف مائل ہونے سے۔ انتہٰی۔

اور فرمایا کہ توبہ ایسی ہونی چاہیئے کہ پھر معصیت کی جانب پلٹنے کا خیال کرے نہ اور کسی گناہ کا خیال کرے بلکہ گناہوں کو خالص اللہ کے لئے چھوڑ دے۔ تاکہ خاتمہ اچھا ہو۔

اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ ایماندار اپنے گناہ کو مثل پہاڑ کے سمجھتا ہے جو اُس کے سر پہ معلق ہو۔ وہ ڈرتا ہے اس سے کہ کہیں مجھ پر گر نہ جائے اور منافق گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے مکھی ناک پر بیٹھی اور اُس کو اُڑا دیا انتہٰی۔

اب غور کیجئے کہ جب حضرت پیر دستگیر رضی اللہ تعالے عنہ گناہوں سے اس قدر خوف دلاتے ہیں اور توبہ کی ضرورت بیان فرماتے ہیں تو ہم مریدوں کو اُس کا کس قدر اہتمام کرنا چاہیئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من لا یستغفر لا یغفر اللہ لہ و من لا یتوب لا یتوب اللہ علیہ یعنی جو شخص خدا سے مغفرت نہ مانگے خدا اُس کو نہیں بخشتا۔ اور جو شخص توبہ نہ کرے خدا اسکی طرف توجہ برحمت نہیں کرتا یہ روایت کنز العمال میں ہے۔

بہر حال جتنے بزرگان دین ہیں سب نے اپنے مریدوں کو بھی تعلیم و تلقین و وصیت کی کہ گناہوں سے توبہ کیا کریں۔ کیوں نہ ہو حق تعالےٰ کا ارشاد ہے فتوبوآ الی اللہ جمیعا ایھا المؤمنون لعلکم تفلحون یعنی اے ایمان والو تم سب کے سب توبہ کرو۔ اور اللہ کے طرف رجوع ہو اور ارشاد ہے توبوآ الی اللہ توبۃ نصوحا عسیٰ ربکم ان یکفر عنکم سیئاتکم یعنی اے مسلمانو خالص توبہ کرو خدائے تعالےٰ تمہارے گناہوں کو بخش دیگا۔

یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ ذکر و شغل نوافل میں داخل ہیں۔ اور گناہوں سے توبہ کرنا فرض ہے۔ کیونکہ بار بار خدائے تعالےٰ نے اسکا حکم فرمایا ہے۔ اور ظاہر ہے فرض کو چھوڑ کر نوافل کا ادا کرنا مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ نوافل کو ترک کرنے سے مواخذہ نہیں۔ اور فرض کو ترک کرنے پر سوال اور مواخذہ ہو گا۔

فوائد الفواد کی مجلس ہفتم ماہ رجب سنہ ۷۱۵ھ میں لکھا ہے کہ حضرت محبوب الٰہی

قدس سرہ نے فرمایا کہ توبہ تین قسم پر ہے۔ حال۔ ماضی۔ مستقبل۔
حال وہ ہی کہ جو گناہ کیا ہے۔ اُس سے نادم اور پشیمان ہو۔ ماضی وہ ہے
کہ مخالفوں کو خوش کرے۔ اگر کسی سے دس درہم مثلاً غصب کیا ہو اور
اُس سے توبہ کرنے کے خیال سے توبہ توبہ کہے تو یہ توبہ توبہ نہ ہوگی۔ توبہ وہ ہے
کہ درہم اُس کو واپس کرکے اُس کو خوش کرے اور اگر وہ کسی کو بد کہا ہو اس کی
معذرت کرکے اُس کو خوش کرے۔ اور اگر وہ شخص مرگیا ہو تو جتنے بار اُس کی
برائی بیان کی ہے اُس کی تعریف کرے۔ اور اگر شراب سے توبہ کرنا چاہے تو
عمدہ شربتیں اور ٹھنڈا پانی کثرت سے پلائے۔ مقصود یہ ہے کہ توبہ کے
وقت معذرت ہر معصیت کی اسی کے مناسب ہونی چاہئیے توبہ کی تیسری
قسم جو مستقبل ہے وہ یہ ہے کہ نیت کرے کہ آئندہ اوس قسم کا گناہ نہ کروں گا

اس کے بعد فرمایا کہ میں جب شیخ الاسلام فرید الدین قدس سرہ العزیز کی خدمت
میں بیعت کی غرض سے حاضر ہوا تو چند بار فرمایا کہ اپنے خصموں کو راضی کرنا چاہئیے
جب اس میں بہت غلو فرمایا تو مجھے یاد آگیا کہ میرے ذمہ بیس جیتل واجب الادا
ہیں اور ایک شخص سے میں نے کتاب عاریت لی تھی۔ وہ گم ہو گئی ہیں
سمجھ گیا کہ حضرت کشف سے یہ بیان فرما رہے ہیں۔ میں نے یہ خیال کرلیا کہ
جب دہلی جاؤنگا تو ان کو خوش کر دونگا۔ جب اجھودھن سے دہلی آیا
اُس وقت میری معیشت بہت کم تھی۔ کبھی پانچ جیتل میرے پاس جمع

ہوے اور کبھی زیادہ۔ ایک بار دس جیتل جمع ہوگئے تو اُس بزاز کے مکان
پر گیا جس سے کپڑا لیا تھا۔ جن کی قیمت بیس جیتل میرے ذمہ تھی اور اُس سے
کہا کہ بیس جیتل تمہارے میرے ذمہ ہیں۔ مجھے ایک دفعہ میسر نہ آئے۔
یہ دس جیتل جو لایا ہوں ان کو لے لو۔ اور باقی بھی انشاء اللہ دے دونگا
جب اُس نے یہ بات سنی۔ کہا کہ ہاں تم مسلمان کے پاس سے آتے ہو
اور وہ لے لیا۔ اور کہا کہ باقی دس جیتل تمہیں معاف کر دیا۔ اس کے بعد
اُس شخص کے پاس میں گیا۔ جس سے کتاب لی تھی اُس سے کہا کہ جو کتاب
آپ سے میں لے لی تھی وہ گم ہوگئی۔ اب کہیں سے اُس کی نقل لے کر آپ کو
پہنچا دونگا۔ اُس نے یہ سنکر کہا کہ ہاں جہاں سے تم آئے ہو اُس کا ثمرہ یہی
ہونا چاہیئے۔ اُس کے بعد کہا کہ میں نے وہ کتاب آپ کو بخش دی انتہیٰ۔
اور فوائد الفواد کی مجالس ۲۱ ، ذیقعدہ ۷۱۸ھ میں مذکور ہے کہ جو شخص
شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے اور بیعت کرتا ہے تو وہ خدائے تعالےٰ کے
ساتھ عہد و پیمان ہے۔ چاہیئے کہ اُس پر ثابت رہے۔ اور اگر اس سے
پریشانی ہوتی ہے تو اپنی حالت پر ہی رہے شیخ کا ہاتھ پکڑنے کی کیا ضرورت؟
اُس کے بعد فرمایا کہ میں جب شیخ الاسلام فرید الدین قدس سرہ العزیز کی
خدمت میں پہنچا۔ اور بیعت سے مشرف ہوا تو واپسی کے وقت راستہ
میں مجھے شدت سے پیاس لگی۔ ہوا نہایت گرم تھی۔ اور پانی دور تھا۔ اسی

حالت میں چلا جارہا تھا کہ ایک شخص نظر آیا جس کو میں پہچانتا تھا اُس کے پاس جاکر کہا کہ میں پیاسا ہوں کیا یہاں پانی مل سکتا ہے اُس نے تپاک سے مل کر کہا اس برتن کو لیجئے۔ اور پی جئے۔ میں نے دیکھا کہ اُس میں شراب یا بنگ ہے میں نے اُس کے پینے سے انکار کیا۔ اُس نے کہا کہ اس مقام میں دور دور تک کہیں پانی نہیں ہے۔ اور آگے بھی پانی نہیں۔ اگر یہ تم نہ پیوگے تو ہلاک ہو جاؤگے۔ میں نے کہا خیر یہی ہوگا کہ میں مرجاؤنگا جو کچھ ہونا ہے ہورہیگا۔ مگر میں یہ نہیں پی سکتا۔ اس لئے کہ میں نے شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے۔ اور اقرار کیا ہے کہ یہ ہرگز نہ ہوگا۔ یہ کہکر روتا ہوا میں چلا۔ اور تھوڑی دور پر پانی مل گیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ خواجہ حمید سوالی جب خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ العزیز سے بیعت کرکے اپنے گھر آئے تو قدیم دوست آشنا جمع ہوئے اور کہا کہ چلئے ذوق حاصل کریں۔ خواجہ حمید نے کہا کہ میں نے اپنا ازار بند ایسا مضبوط باندھا ہے کہ قیامت میں بھی حوران بہشت پر نہ کھولونگا انتہیٰ۔

اور اسی کی مجلس (۲۰) جمادی الاول میں لکھا ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ ایک مطربہ قمر نام نہایت حسن و جمال میں شہرۂ آفاق تھی۔ آخر عمر میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کرکے زیارت کعبہ کے لئے گئی۔ جب واپسی میں ہمدان کو پہنچی تو والی ہمدان نے اس کی

خبر سنکر اُس کو بلوایا اُس نے کہا کہ میں اس کام سے توبہ کر چکی ہوں۔ والی نے اُس کا عذر قبول نہ کیا۔ آخر وہ عورت عاجز ہو کر شیخ یوسف ہمدانی کے خدمت میں گئی۔ اور واقعہ بیان کیا۔ شیخ نے فرمایا۔ آج رات کو میں تمہارے معاملہ میں مشغول ہونگا اور کل جواب دونگا۔ صبح ہی وہ عورت شیخ کی خدمت میں پھر حاضر ہوئی۔ شیخ نے فرمایا کہ ابھی تمہارے خانۂ تقدیر میں ایک معصیت باقی ہے عورت عاجز ہو گئی۔ اور ملازمین والی اسے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ اور ایک چنگ لاکر اس کو دیا۔ اُس نے چنگ کو درست کرکے گانا شروع کیا چند اشعار پڑھے تھے۔ کہ سب پر حالت طاری ہوئی۔ اور بادشاہ ہمدان نے سب سے پہلے توبہ کی انتہی۔

اب غور کیجئے کہ بیعت کا کس قدر اثر ہوتا تھا کہ مرجانا قبول مگر خلاف شرع بنگ وغیرہ پینا ناگوار۔ اسی وجہ سے ان حضرات کی بیعت پر ثمرات مرتب ہوتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ تو محبوب ہونے والے تھے بلکہ ازلی محبوب تھے۔ ان کی ہمت اگر بلند تھی تو چنداں تعجب کی بات نہیں اس کسبی کا حال آپ نے دیکھ لیا کہ بیعت کے بعد پھر گناہ کا کبھی ارادہ نہ کیا اسی علوئے ہمت اور بیعت پر قائم رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر گناہ بھی کیا تو اُس گناہ کے طفیل میں بادشاہ اور اُس کے مصاحبین کو توبہ کرا کے چھوڑا۔

نفحات الانس میں مولانا جامی رحمہ نے حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ کے حال میں لکھا ہے کہ آپ نے مریدین کو فرمایا کہ اپنے نفس کو متہم بنا رکھو جو شخص بعنایت آلٰہی اپنے نفس کی بدی کو پہچانے اور اُس کے مکر و کید کو جانے اُس پر یہ کام یعنی نفس کو متہم سمجھنا آسان ہے۔ سالکان طریقت ایسے بہت گذرے ہیں کہ دوسرے کے گناہ کو اپنے ذمہ لے کر اُس کا بار اُٹھایا کرتے تھے۔

اور فرمایا کہ ہمارا طریقہ متابعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مضبوط پکڑنا اور صحابہ کے آثار کا اقتدا کرنا ہے۔ اسی طریقے میں تھوڑے عمل سے زیادہ فتوح ہوتی ہے انتہیٰ۔

ہمارے زمانے کے بعض حضرات صاف کہتے ہیں کہ ہمیں نماز روزہ وغیرہ عبادات کی ضرورت نہیں۔ ہم نے ترک وجود کر دیا ہے۔ اور اس پر اس شعر سے استدلال کرتے ہیں ؎

نمازِ عاشقاں ترکِ وجود است

نمازِ زاہداں سجدہ سجود است

اور مریدین بھی اپنے پیر کے مسلک پر مرفوع القلم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت مرفوع القلم ہیں۔ یعنی عقل و ادراک جاتا رہا ہے اور اچھے برے میں تمیز باقی نہیں جس طرح مجذوبوں کا حال ہے

مطالعہ جات صاحب اسلام

تو اُن کا مرفوع القلم ہونا درست ہے۔ اور اگر یہ حالت نہیں ہے چنانچہ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے دعوے پر دلائل قائم کرتے ہیں تو وہ عند اللہ مرفوع القلم نہیں ہو سکتے۔ دیکھئے حضرت منصور حلاج رح باوجودیکہ انا الحق کہتے تھے۔ اور ان کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ چنانچہ آخر بفتواے جنید بغدادی رح وغیرہ اکابر صوفیہ و علماء اسی قول کی وجہ سے وہ دار پر چڑھائے گئے۔ مگر عبادت کو اُنہوں نے کبھی ترک نہ کیا۔
نفحات الانس میں لکھا ہے کہ باوجود دعوے انا الحق کے ہر شبانہ روز وہ ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ جس صبح وہ قتل ہوئے اس رات میں پانچ سو رکعت نماز اُنہوں نے پڑھی تھی۔
تنبیہ المغترین میں امام شعرانی رح نے لکھا ہے کہ صوفیہ کے اخلاق میں سے کثرت توبہ اور استغفار بھی ہے۔ کیونکہ وہ اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اپنے افعال گناہ سے سالم نہیں رہ سکتے۔ کم سے کم خشوع اور مراقبہ میں نقص ہو ہی جاتا ہے سلف صالح اسی طریقہ پر تھے۔ ہمارے زمانے میں بعض صوفیہ اس کے خلاف میں ہیں۔ یہاں تک کہ بعض صوفیہ سے یہ کہتے سنا ہے کہ ہم وہ قوم ہیں کہ بحمد اللہ ہم پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کیونکر۔ کہا۔ اس وجہ سے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ہی فاعل ہے۔ نہ ہم۔ میں نے کہا۔ جب تو تم پر توبہ اور استغفار

واجب ہے۔ کیونکہ تم نے جمیع ارکان شریعت کو منہدم اور حدود شرعیہ کو باطل کر دیا۔ قسم ہے اللہ کی۔ اگر مجھے حکومت ہوتی تو تم جیسے لوگوں کی گردنیں مارتا۔ کیونکہ کل انبیا اور جمیع اکابر دین جانتے تھے کہ وہی خالق افعال ہے اور باوجود اس کے اتنا روتے تھے کہ اُن کے آنسوؤں سے گھانس اُگتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کیا تمہاری بیماری اور دوا کی خبر نہ دوں۔ تمہاری بیماری گناہ ہیں۔ اور دوا استغفار انتہی ملخصاً دیکھئے امام شعرانی رح اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ اور تمام صوفیہ سلف کے حال سے خبر دے رہے ہیں۔ کہ سب استغفار اور توبہ کیا کرتے تھے تو ہم لوگوں کو گناہ سے احتراز کرنے اور اس سے توبہ کرنے کی کس قدر ضرورت ہے۔

نفحات الانس میں شیخ ابوالحسن شاذلی رح کے حال میں لکھا ہے ان کا بیان ہے کہ میں نے غار میں قیام کیا۔ اور وصول الی اللہ طلب کر کے دل میں کہتا تھا کہ کل فتح ہو جائے گی۔ یکایک ایک شخص آیا۔ میں نے پوچھا تم کون ہو۔ کہا عبد الملک۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اولیاء اللہ سے ہیں۔ میں نے کہا آپ کا کیا حال ہے۔ کہا آپکا کیا حال۔ آپ کا کیا حال۔ آپکا کیا حال۔ اُس شخص کا کیا حال ہوگا کہ کہتا ہے کہ کل فتح ہو جائے۔ اور کئی برسوں فتح ہو جائے۔ نہ ولایت ہے نہ فلاح۔ اے شخص خدائے تعالے

عبادت خاص خدائے تعالےٰ کے لئے کیوں نہیں کرتا۔ میں اُس وقت
سمجھ گیا کہ یہ بزرگ خاص تعلیم کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ میں نے اُسی وقت
توبہ کی اور استغفار کیا۔ اُس کے بعد فتح باب بھی ہو گیا۔ انتہی۔
دیکھئے ان حضرات کو خطرات اور خیالات پر توبہ کرنے کی ضرورت ہوتی
ہے۔ بر خلاف اس کے کھلے کھلے گناہ جن کے خلاف مرضی الٰہی ہونے
میں ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا۔ اُن گناہوں سے توبہ نہ کی جائے تو
کہئے کہ فتح باب جو پیری مریدی سے مقصود ہے کیونکر ہو سکے۔
اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ نے حضرت
خواجہ بزرگ معین الدین چشتی قدس سرہ العزیز کے حال
میں آپ کا ارشاد نقل کیا ہے۔ شقاوت کی علامت یہ ہے کہ آدمی
معصیت کرے اور امید رکھے کہ میں مقبول ہونگا۔ انتہیٰ۔
یہ ارشاد خاص اہل طریقت سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مقبولیت
کی گفتگو اسی طبقہ میں ہوتی ہے۔ اور ہونا بھی چاہئیے۔ اس لئے
کہ یہ حضرات دنیا کے دھندے چھوڑ کر خدائے تعالےٰ کی طرف متوجہ
ہوتے ہیں۔ یعنی ذکر و شغل وغیرہ میں اکثر اوقات مشغول رہتے ہیں
اس کے بعد ضرور یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ اپنی محبت و جان فشانی
رائگاں نہ جائے گی۔ اور ہم مقبول بارگاہ کبریائی ہوں گے۔ ان

حضرات کو حضرت خواجہ بزرگ رح فرماتے ہیں کہ یہ علامت شقاوت ہے
مقبول تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو کوئی کام خلاف مرضی الٰہی نہیں کرتے
اور اگر بمقتضائے بشریت کر لیا تو اُس کے معذرت اور توبہ کرتے ہیں۔
بخلاف اس کے خلاف مرضی الٰہی کام بھی کریں۔ اور امید رکھیں کہ ہم
مقبول الٰہی ہیں۔ اس قسم کا خیال پیدا ہونا ضرور شقاوت کی علامت
ہے۔ اور یہ بھی ارشاد حضرت کا نقل کیا ہے کہ از منزل گاہ قرب نزدیک
نشود مگر بفرمان برداری در نماز۔ زیراکہ معراج مومن ہمیں نماز است انتہی
دیکھئے قرآن شریف میں اقیموا الصلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرو۔
کتنی جگہ وارد ہے۔ اور احادیث میں کس قدر اس کا اہتمام ہے یہانتک
کہ نماز کو قصداً ترک کرنے والے کو حضرت نے کافر تک فرما دیا۔ غرض کہ
فرمان برداری نماز ضروریات دین سے ہے اسی وجہ سے خواجہ بزرگ
قدس سرہ نے صاف فرما دیا کہ بغیر نماز کے تقرب الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا۔
اب اگر تاویل کر کے کوئی نماز ہی دوسری قرار دی جائے تو فرقہ باطنیہ اور
صوفیہ میں فرق ہی کیا ہوا۔ اُنہوں نے بھی ایسے ہی تاویلیں کر کے تمام
عبادات کو ساقط اور زنا وغیرہ کو مباح کر دیا تھا۔

اخبار الاخیار میں شیخ نصیر الدین محمود رح جو محبوب الٰہی قدس سرہ کے
خلیفہ ہیں آپ کے حال میں لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ (من چہ لائقم کہ شیخی کنم۔

امروز خود ایں کار بازی بچگاں شد۔ بعد ازاں بیت ثنائی خواند۔ بیت۔
مسلماناں مسلماناں مسلمانی مسلمانی ؞ ازیں آئین بے دیناں پشیمانی پشیمانی
دیکھئے اُس زمانہ کی مشائخی کو آپؒ نے بچوں کا کھیل قرار دیا۔ وہ اسی قسم کی مشائخی ہوگی کہ ضروریات دین سے جس کو کوئی تعلق نہ ہو۔ اور آپؒ کا قول اُس میں نقل کیا ہے کہ بیعت کے وقت جو سر کے بال تراشے جاتی ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی نے طریقت میں قدم رکھا تو گویا اُس نے اس راہ میں اپنا سر کٹا دیا۔ اور سر بریدہ سے کوئی کام وجود میں نہیں آسکتا۔ تو چاہیئے کہ موئے سر تراشیدہ سے بھی کوئی نامشروع کام وجود میں نہ آئے انتہیٰ۔

دیکھئے طریقت میں اس امر کی کس قدر ضرورت ہے کہ خلاف شرع کام ترک کرنے کے لئے بیعت سے پہلے گویا یہ اقرار لیا جاتا تھا۔

اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ

(الذی) موصول اور اُس کے بعد کا جملہ صلہ ہے۔ موصول اور صلہ میں ربط تام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مفرد ہوتا ہے۔ کیونکہ صلہ میں موصول کا حال ہوتا ہے۔ موصول ہر چند ذات معین پر دلالت نہیں کرتا۔ مگر صلہ کے ساتھ مل کر معرفہ ہو جاتا ہے

موصول و صلہ

اس لئے کہ جو حالت اس کی صلہ میں بیان کی جاتی ہے اُس کو مخاطب جانتا ہے جس سے اُس کی تعیین ہو جاتی ہے۔ مثلاً الذی ضربک فی الدار یعنی جس نے تجھے مارا ہے وہ گھر میں ہے۔ چونکہ مارنے والا مخاطب کو معلوم ہے اس لئے اُس کی تعیین ذہن مخاطب میں ہو گئی اس کی مثال ایسی ہے جیسے حق تعالے کی ذات۔ کہ کوئی اُس کو پہچان نہیں سکتا۔ کیونکہ وہاں تک نہ عقل کی رسائی ممکن ہے نہ فہم و خیال کی اُس وجہ سے کہ عقل انہی چیزوں کا ادراک کر سکتی ہے جو از قسم محسوسات ہوں جیسا کہ ہم نے کتاب العقل میں اس سے متعلق مبسوط بحث کی ہے۔ اور خدائے تعالے کی ذات ایسی نہیں کہ اُس کا ادراک حواس سے ہو سکے یا عقل و وہم سے۔

غرض کہ ذات الٰہی کی معرفت محال ہے۔ ممکن نہیں کہ سوائے خدائے تعالے کے کسی کو اُس کا ادراک ہو سکے۔ البتہ اس قدر ادراک ہو سکتا ہے بلکہ ضروری ہے کہ خدائے تعالے موجود ہے۔ اور خالق عالم ہے۔ اور سنتا ہے۔ دیکھتا ہے۔ اور جتنے صفات کمالیہ ہیں سب کے ساتھ متصف ہے۔ مقصود یہ کہ ذات کے ساتھ صفات کا لحاظ ہونے سے اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے جیسے موصول کے ساتھ صلہ ملنے سے اسی وجہ سے ماعرفناک حق معرفتک وارد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ الٰہی

ہم نے تجھکو پہچانا مگر جو پہچاننے کا حق ہے وہ معرفت نہیں۔ موصول کی معرفت صلہ کے ملنے سے جو حاصل ہوتی ہے اور موصول میں جو وحدت آجاتی ہے وہی بات یہاں بھی ہے۔ پھر معرفت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں۔ جس قدر توجہ اور صفائی ذہن زیادہ ہو معرفت زیادہ ہوگی۔ اس زیادتی معرفت کے واسطے اولیاء اللہ اور مرشدین کامل مراقبہ کی تعلیم کیا کرتے ہیں۔ جس کے معنی نگہبانی کرنے کے ہیں۔ ذات کے ساتھ ایک ایک صفت کا مدتوں مراقبہ کراتے ہیں۔ تاکہ اُس صفت سے متعلق لوازم و آثار پورے طور پر ذہن میں راسخ اور متمکن ہوجائیں۔ جس قدر مدت میں مراقبہ ہو اُس میں مشاہدہ ضرور ہوگا۔ کیونکہ مشاہدہ کے معنی حضور کے ہیں۔ یہ مشاہدہ گو ذات حق کا ہوگا۔ مگر کسی صفت خاصہ کے ساتھ۔ کیونکہ ذات بحت کا مشاہدہ غیر متصور ہے۔ اس لئے کہ ذات کا جب ادراک ہی نہیں تو شہود کیونکر ہوسکے اسی وجہ سے حدیث شریف میں وارد ہے کہ لا تتفکروا فی ذات اللہ یہ امر پوشیدہ نہیں کہ جب آدمی مدتوں کسی ایک چیز کا مراقبہ کرے یعنی ہمہ تن اُس کی طرف مشغول ہوا ور کسی دوسری چیز کا خیال نہ آنے دے تو اُس سے متعلق کیسی کیسی نزاکتیں اور دقائق کا وجود اُس کو حاصل ہوگا۔ دیکھئے حکما مسائل حکمیہ میں جو موشگافیاں کرتے تھے اُس کا منشاء یہی مراقبہ ہوا کرتا تھا۔ وہ پہلے خلوت اختیار

کرتے تھے۔ چنانچہ افلاطون کا حال مشہور ہے کہ کہیں شکستہ خم اس کو مل گیا تھا اُس میں وہ رات بسر کرتا اور دن کو تنہائی میں۔ غرض کہ دن رات مسائل حکمیہ کے مراقبہ میں مشغول رہتا جس کی وجہ سے اُس کی ایک غیر معمولی حالت ہوگئی تھی۔ چنانچہ تفسیر نیشاپوری میں اُس کے متعلق جالینوس کا قول نقل کیا ہے کہ ھو انسان تالّٰہ او الٰہ تانّس یہی حال تقریباً کل حکما کا تھا کہ تنہائی میں ایک ایک مسئلہ میں مدتوں غور اور فکر کرتے یہاں تک اس کے مالہ اور ماعلیہ کا علم بقدر طاقت بشری حاصل کرتے تھے۔

اب غور کیجئے کہ جو لوگ دنیا کو چھوڑ کر ہمیشہ مراقبہ اور مشاہدۂ آلٰہی میں رہتے ہیں اُن پر ذات و صفات الٰہیہ سے متعلق کیسے کیسے مسائل غامضہ منکشف ہوتے ہوں گے اور ان کا یہ مجاہدہ کس درجہ بارآور ہوتا ہوگا۔ حق تعالےٰ فرماتا ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا یعنی ہماری راہ میں مجاہدہ کریں تو ضرور ہم ان کو اپنے رستے بتادیں گے۔ جب خدائے تعالےٰ ان کو اپنے وصول و تقرب کی راہیں بتا دینیکا ذمہ دار ہو تو ممکن نہیں کہ وہ گمراہ ہوسکے مگر یاد رہے کہ ہر مجاہدہ باعث تقرب نہیں ہوسکتا۔ اُس میں بڑی شرط یہ ہے کہ خاص خدائے تعالےٰ کی خوشنودی اور فرمانبرداری پیش نظر ہو۔ اگر مجاہدہ اور ذکر و شغل میں کوئی دوسرا امر پیش نظر ہو مثلاً کشف یا کرامات یا یہ امر

ہم مقتدا کہلائیں اور لوگ ہماری قدر و تعظیم و توقیر کریں یا دست غیب حاصل ہو یا اور کوئی ایسی چیزیں جن کی خواہش نفس کو ہوتی ہے مجاہدہ میں ملحوظ ہوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ شیطان کو موقع مل گیا۔ اسی وجہ سے پہلے وہ ذہن نشین کر دیتا ہے کہ شریعت عام لوگوں کے واسطے ہے اور خاص لوگوں کا درجہ بہت بلند ہے ان کو شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے قدم میں صوفی صاحب کو خاص لوگوں میں شریک کر کے مرفوع القلم بنا دیتا ہے۔ اب ان کو کون روکے نہ خدا کے روکے رک سکیں نہ رسول کے۔ کیونکہ قرآن و حدیث سے تو تعلق رہا ہی نہیں۔ اب وہی حالت پیدا ہو گئی جو ایمان لانے سے پہلے تھی۔ اس لئے جس طرح ایمان لانے والے کو ایمان سے پہلے بے قیدی تھی اس قسم کے مرفوع القلم ہونے سے بھی وہی بے قیدی ہو جائے گی غرض کہ دونوں حالتوں میں عقلاً کوئی فرق نہیں۔ اس صورت میں شیطان جس طرح چاہے گا کام کرا کے چھوڑے گا۔ اسی وجہ سے اکابر اولیاء اللہ نے شریعت کی پابندی کو ضروری لکھا ہے۔ چنانچہ اکابر طرق کے اقوال اس باب میں جو مروی ہیں اوپر لکھے جا چکے ہیں۔

موصول صلہ میں ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ صلہ کا اثر موصول پر پڑتا ہے دیکھئے کہ جب الذی کہا جائے تو اُس سے متعلق نہ عداوت

ہوتی ہے نہ محبت وغیرہ بلکہ اُس کا مفہوم صرف ایک چیز ہوتی ہے جس سے
نہ عداوت متعلق ہے نہ محبت۔ پھر جب اُس کے صلہ میں ضرب یا
یا اُس کے مثل کوئی افعال ذکر کئے جائیں تو مفہوم موصول سے عداوت
دل میں پیدا ہوگی اور اگر مثل اعطاء کوئی صلہ ذکر کیا جائے تو اس سے
محبت پیدا ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ صلہ کا اثر موصول پر پڑتا ہے نفس
ناطقہ یا روح انسانی کی حالت بمنزلۂ موصول کے ہے کہ اس کے ساتھ
افعال کا اتصال لازمی ہے جس طرح صلہ کا اتصال موصول کے ساتھ
لازمی ہے۔ کیونکہ جو صفات نفس ناطقہ میں رکھے گئے ہیں جیسے سخاوت
بخل۔ شجاعت وغیرہ اُن سے متعلق افعال کا ظہور ضروری ہے۔ ورنہ
اُن صفات کا وجود بیکار ہوگا۔ اور افعال کے صدور کے وقت نفس کو
اُن افعال کا ادراک ضرور ہوتا ہے۔ اور ہر فعل کے موجود کرنے کا ارادہ
کرکے اپنی قوت کو صرف کرتا ہے۔ اور جن جن اعضا سے وہ کام متعلق
ہوتا ہے ان کو حرکت دیتا ہے اُس کے بعد لذت کا احساس بھی اسی کو
ہوتا ہے جو وجود فعل سے متعلق ہے۔ خواہ وہ لذت جسمانی ہو یا نہ ہو۔
غرضکہ ابتدائے حدوث خطرۂ فعل سے وقوع فعل تک نفس کے
ساتھ فعل متعلق رہتا ہے اُس کے بعد جب خیال آتا ہے نفس کو
اُس کے ساتھ تعلق رہتا ہے۔ اسی وجہ سے نفس میں اُس کا اثر رہ جاتا ہے

ما اثر افعال در نفس

اور وہ اثر باقی رہ جاتا ہے۔ اگر وہ اچھا کام موافق مرضی الٰہی ہے تو نفس میں اچھا اثر ہوتا ہے۔ اور برا کام ہو تو برا اثر۔ انہی آثار سے اچھے اور برے نفوس باہم ممتاز ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو کشف ہوتا ہے ان کی نظر نفوس کے حسن و قبح پر پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے اچھے لوگوں کی وہ تعظیم و توقیر کرتے ہیں اور معمولی لوگوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ نفس ناطقہ میں افعال کے اثر کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے عفونت وغیرہ ہوا میں اثر کرتی ہے۔ اور ہوا کو جو انسان کی روح کو تازگی اور فرحت بخشتی ہے ان اشیائے خارجیہ کی وجہ سے جاں گزا اور مہلک بنا دیتی ہے جیسا کہ حال کتب طبیّہ میں مصرح ہے اسی طرح بُرے افعال روح میں اثر کر کے اس کو گندہ اور مہلک بنا دیتے ہیں۔ جس کی صحبت میں جو شخص جائے وہ ہلاک ہو جائے۔ جب روح گناہوں کی اثر سے زنگ آلود ہو جاتی ہے تو خدائے تعالےٰ نے اُس کی صیقل توبہ مقرر فرمایا ہے۔ جس سے گناہ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ یہاں یہ بات بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ گناہ میں دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک معصیت یعنی نافرمانی کہ خدائے تعالےٰ نے کسی کام کے کرنے کو فرمایا ہو۔ مثلاً نماز روزہ حج زکوٰۃ۔ صبر۔ شکر وغیرہ اور وہ نہ کرے یا کسی کام سے منع

گناہ میں دو جہتیں ہیں

فرمایا

فرمایا ہے جیسے شراب پینے۔ حرام کھانے اور زنا و قتل وغیرہ کرنے
سے منع فرمایا ایسے کام کریں یہ دونوں صورتیں یعنی مامور کام کا نہ کرنا
اور ممنوع کا کرنا معصیت ہیں اور دوسری جہت حق کی ہے۔ مثلاً عبادت
حق اللہ ہے اور زکوٰۃ میں مال سے حق الٰہی متعلق ہو جاتا ہے۔ اور کسی کا
مال ناجائز طریقہ سے لینے میں معصیت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس سے
منع فرمایا اور چونکہ وہ مال کسی شخص کا ہے۔ بندہ کا حق اس سے متعلق
ہے۔ علیٰ ہذا القیاس حق اللہ یا حق الناس گناہوں میں ضرور ہوتا ہے
توبہ کرنے سے جو چیز معاف ہوتی ہے وہ معصیت ہے۔ کیونکہ نافرمانی
کے بعد جب آدمی معذرت کرکے فرماں برداری کرنے کا اقرار کرتا ہے
تو نافرمانی سابقہ قابل معافی سمجھی جاتی ہے۔ مگر جو حق ذمہ پر ثابت ہو گیا
وہ معاف نہیں ہوتا اگر کسی شخص نے نمازیں قضا کی ہوں اُس کے بعد
توبہ کرکے نماز پڑھنا شروع کرے تو جن ایام کی نمازیں نہیں پڑھیں اسکی
قضا کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے اگر نمازیں یا روزے وغیرہ کسی
کے ذمہ باقی رہ گئے ہوں اور ان کی اُس نے قضا نہیں کی تو بعد وصیت
اُس کے بدلہ میں مال دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر کسی نے رشوت
سے مثلاً توبہ کی تو معصیت معاف ہو جائے گی مگر جو مال لیا تھا وہ واپس
کرنے کی ضرورت ہے ورنہ قیامت میں اُس کا معاوضہ دلایا جائیگا۔

ف توبہ سے حق العباد معاف نہیں ہوتا

غرض کہ توبہ سے صرف معصیت کی معافی ہوسکتی ہے۔ حقوق سے اُس کو تعلق نہیں اس میں شک نہیں کہ حق تعالےٰ اگر چاہے تو اپنے حقوق معاف کر دے۔ اور قادر ہے کہ دوسروں کے حقوق کو بھی معاف کرا دے مگر یہ قاعدہ نہیں ہوسکتا۔ اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس پر جو کچھ حقوق ہیں عموماً سب کو حق تعالےٰ معاف کر دیگا اور کروا دیگا اگر ایسا ہو تو تمام مصالح تمدن درہم و برہم ہو جائیں گے۔ عقل ہرگز جائز نہیں رکھتی۔ کہ ظالم اور مظلوم دونوں حق تعالےٰ کے نزدیک برابر اور قابل ترحم ہوں۔ رہا یہ کہ قرآن شریف میں ہے قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم یعنی اے محمدؐ کہدو کہ اے گناہ گارو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اللہ سب گناہوں کو بخشتا ہے وہ غفور و رحیم ہے سو یہ ارشاد اس وقت ہوا تھا کہ بعض لوگوں نے اسلام لانے میں یہ عذر کیا تھا کہ ہم نے بڑے بڑے گناہ کئے اب اسلام لانے سے کیا فائدہ ان کو جواب دیا گیا کہ خدائے تعالےٰ سب گناہوں کو بخش سکتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے بعد ہی یہ آیت ہے وانیبوا الی ربکم و اسلموا لہ الایہ جس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالےٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اسلام لاؤ۔ قبل اس کے

کہ تم پر عذاب نازل ہو۔ غرض کہ قرآن و حدیث سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا کہ حقوق اللہ اور حقوق عباد کا بالکل مؤاخذہ نہ ہوگا۔ بلکہ ہزارہا آیات و احادیث و آثار سے مؤاخذہ ثابت ہے اس لئے مقتضائے عقل یہی ہے کہ آدمی اسی عالم میں مؤاخذوں سے حتی الامکان برارت حاصل کرلے۔

فی صدور الناس صدر سینہ کو کہتے ہیں۔ سینہ وہ مقام ہے جس میں دل رکھا گیا ہے۔ گویا سینہ دل کا مکان ہے۔ شیطان وسوسہ انداز بھی اسی گھر میں رہتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً برے مشورے دیتا جاتا ہے یہی وساوس شیطانی ہیں۔ سینہ کی حقیقت جو ظاہراً معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ چند ہڈیوں اور گوشت وغیرہ سے مرکب ہے مگر دراصل اس کی حقیقت کچھ اور ہی ہے جس طرح انسان کا حال کہ دیکھنے کو وہ ہڈیاں اور گوشت پوست سے مرکب ہے اور اس میں اور بندر وغیرہ میں کوئی فرق نہیں۔ مگر حقیقت انسان کی دیکھی جائے تو وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ جس کا ادراک ممکن نہیں کیونکہ وہ ایسی لطیف چیز ہے جس سے حواس بالکل بے خبر ہیں۔ یہ جسم جس کو دیکھنے والے انسان کہتے ہیں وہ انسان کا قدرتی غلاف یا لباس ہے۔ جس کے ٹوٹنے پھوٹنے سڑنے گلنے سے انسان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی حالت پر محفوظ رہتا ہے۔ مقاصد الاسلام کے حصہ دوم میں ہم نے

تفسیر فی صدور الناس

صدر

حقیقت صدر

جسم انسان کا غلاف

یہ امر بدلائل ثابت کیا ہے کہ مسمریزم والے اس امر کا مشاہدہ کرا دیتے ہیں
کہ جسم انسانی اپنے مقام پر پڑا رہتا ہے اور انسان ہزارہا کوس جاکر وہاں کی
خبریں چند دقیقوں میں لاتا ہے۔ حکمت جدیدہ تصدیق اسی امر کی کر رہی ہے
جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرا سو سال پیشتر خبر دی تھی۔ دیکھئے
تمام کتب احادیث و سیر سے ثابت ہے کہ غزوۂ بدر میں جب کفار
کو ہزیمت ہوی۔ اور اُن کے مقتولوں کی لاشیں پھول گئیں۔ حضرت
نے فرمایا کہ ان لاشوں کو کنویں میں ڈالدو۔ چنانچہ سب ڈالدی گئیں۔
اُس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن مقتولوں کو پکار کر فرمایا
اے کنویں والو! اے عتبہ، اے شیبہ۔ اے امیہ۔ اے
ابو جہل۔ کیا تمہارے رب نے جو وعدہ فرمایا تھا اُس کو تم نے حق پایا؟
میں نے تو وہ وعدہ حق تعالے نے جو مجھ سے کیا تھا حق پایا۔ صحابہؓ نے
عرض کی یارسول اللہ کیا آپ ایسی قوم کو پکارتے ہو جس کی لاشیں
سڑ گئیں۔ آپ نے فرمایا جو میں اُن سے کہہ رہا ہوں۔ اس کو وہ لوگ
ایسا سن رہے ہیں جو تم اُن سے زیادہ نہیں سنتے لیکن وہ میرا جواب
نہیں دے سکتے۔ چنانچہ حسان بن ثابت رضؓ نے اس موقع میں ایک
قصیدہ لکھا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

ینادیھم رسول اللہ لما ؛ قذفناھم کباکب فی القلیب

الم تجد واکلامی کان حقا ٭ وامراللہ یاخذ بالقلوب

وجہ تھے صحابہ نے یہی خیال کیا تھا کہ سڑی ہوئی لاشوں کو پکار کر اُن سے
باتیں کرنی بالکل خلاف عقل ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات
اشارۃً بیان فرمادی کہ آدمی جسم کا نام نہیں جسم بمنزلہ غلاف ہے۔ اصل آدمی
جو سننے والا ہے اُس میں کوئی تغیر نہیں جیسے وہ زندگی میں سنتے تھے۔ اب
بھی سنتے ہیں۔ صحابہ اور قوی الایمان تو مان گئے۔ مگر خلاف عقل ہونیکی
وجہ سے بہت سے لوگوں نے اُس میں تاویلیں کیں۔ چنانچہ "سماع موتی"
کا مسئلہ اب تک معرکۃ الآرا بنا ہوا ہے۔ سائنس نے آکر اس کا تصفیہ
کردیا۔ اب اُس میں کسی کو چون وچرا کی گنجائش نہ رہی اس سے اس مسئلہ کا
بھی تصفیہ ہوگیا جو احادیث میں وارد ہے کہ دفن کے بعد فرشتے مردے
سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ اور تیرا دین کیا ہے؟ اور یہ شخص
یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو کیا سمجھتا تھا؟ اگر ایمان دار ہو تو ان کے جواب
دیتا ہے اور بے ایمان جواب نہیں دے سکتا۔ اس پر بھی اقسام کے
اعتراضات ہوتے تھے کہ (مردے) سے سوال کیسا۔ چونکہ معترضوں نے
غلاف انسان کو انسان سمجھ رکھا تھا اور اب ثابت ہوگیا کہ انسان کچھ اور
ہی چیز ہے جس میں سوال وجواب کی اس حالت میں بھی صلاحیت ہے
اس کے بعد اہل انصاف تو ہرگز جاہلانہ خیال نہیں کرسکتے کہ انسان اسی

غلاف کا نام ہے جو کالبد انسانی ہے۔ اسی طرح سینہ اور دل کی حقیقت بھی ضرور کوئی دوسری چیز ہے۔ اسی کو خیال کر لیجئے کہ اگر دل اسی گوشت کی بوٹی کا نام ہو جو ہر جانور میں ہے تو علوم حکمیہ اور غامض مسائل جو حکما اور علماء کے دلوں میں جوش زن ہوتے ہیں جن کے عمدہ آثار وقتاً فوقتاً عالم میں ظہور پاتے ہیں تو وہ بوٹی دل کی جانوروں میں بھی ہے کسی جانور سے ان کا ظہور کیوں نہیں ہوتا۔ میری دانست میں کوئی عاقل یہ باور نہ کرے گا کہ یہ لطیف غامض مسائل اس گوشت کی بوٹی میں رہتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کہنا پڑیگا کہ یہ مضغۂ صنوبری دل کا غلاف ہے اور دل ایک لطیفۂ ربانی ہے کسی بزرگ کا قول ہے ؎

اگر یک قطرۂ دل بر شگافی ؛ بروں آید از و صد بحر صافی

اسی طرح صدر کی بھی حقیقت دوسری ہے صرف ہڈیوں کا نام نہیں ہے گو اس حقیقت کا یہی مقام ہوگا۔ اس لئے کہ حق تعالے فرماتا ہے

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام و من یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء یعنی جس کی ہدایت کا ارادہ اللہ تعالے کرتا ہے اُس کے سینہ کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کے سینہ کو نہایت تنگ کر دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان میں

چڑھ رہا ہے انتہیٰ۔

یہ امر ظاہر ہے کہ اسلام لاتے وقت سینہ کے ہڈیاں پھیل نہیں جاتیں اور نہ کفر کی حالت میں ہڈیاں سمٹتی ہیں بلکہ کشادہ اور تنگ ہونے والا سینہ ہی دوسرا ہے۔ یہ ایک وجدانی امر ہے کہ ایمان والوں کے دل میں ایک وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور جو بات بات میں انقباض ہوا کرتا ہے کہ اگر ہم اپنا دین چھوڑ دیں گے تو لوگ کیا کہیں گے اور خلاف عقل باتیں ماننا لوگوں کی طعن تشنیع کا باعث ہوگا۔ کیونکہ وہ کہیں گے کہ اگر ان کو عقل ہوتی تو یہ لوگ خلاف عقل باتوں کو نہ مانتے۔ اور یہ دلیل سفاہت اور حماقت کی ہے چنانچہ کفار اسی وجہ سے مسلمانوں کو سفہا کہتے تھے۔ اس کے سوا بڑا انقباض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ تمام کنبہ کے لوگ اور احباب دشمن ہو جائیں گے۔ غرض کہ اس قسم کے جتنے اسباب تنگدلی اور انقباض کے ہوتے ہیں سب دفع ہو جاتے ہیں۔ اور سینہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور سب کو قبول کر لیتا ہے اور شرح صدر کے بعد جو کام اُن سے لیا جاتا ہے نہایت خوشی اور کشادہ دلی سے کرتے ہیں۔ اگر مال دینے کو کہا جائے تو نہایت مسرت سے امتثال کرتے ہیں۔ چنانچہ صحابہ کے حالات سے ظاہر ہے کہ صرف چندہ کے لئے ارشاد نبوی ہوا تھا بعض حضرات نے اپنا نصف مال حساب کر کے حاضر کر دیا اور بعض نے پورا۔ اگر جان دینے کو کہا جائے تو اُس کو سعادت

سمجھتے ہیں۔ چنانچہ صحابہ کے حالات سے ظاہر ہے کہ جان بازی کے
شوق میں ہر ایک چاہتا تھا کہ دوسرے سے بڑھا رہوں۔ یہاں تک
کہ ان کو روکنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ جب مال اور جان دینے میں تنگدلی
نہ ہو تو دوسرے اسلامی کاموں میں کیونکر ہوسکتی ہے یہ برکت شرح صدر کی ہے
کہ جن کو ہدایت کرنا منظور الٰہی ہوتا ہے ان کا سینہ کشادہ کردیا جاتا ہے
بخلاف اس کے جن کو گمراہ کرنا منظور ہوتا ہے اسلامی کاموں میں ان کا
سینہ تنگ کردیا جاتا ہے۔ جان اور مال دینا تو بڑی چیز ہے پانچ وقت
کی نماز پڑھنی مشکل ہوتی ہے۔ سو روپیہ ایک سال رہیں تو ان میں سے
ڈھائی روپیہ زکوۃ کے غریب قرابت دار اور مساکین کو دینا سخت دشوار
ہوتا ہے۔ حالانکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ اس سے زیادہ روپیہ
خیرات ہی میں صرف کردیتے ہیں۔ مگر زکوۃ کے نام سے دینے میں ان کو
تنگدلی ہوتی ہے۔ اب کہئے ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ
ضیقا اس موقع میں صادق آتا ہے یا نہیں۔ یہ تو عوام الناس کا حال تھا
اس آخری زمانے کے بعض خاص خاص لوگ بھی اسی دائرہ میں نظر
آئیں گے۔

مشکوۃ شریف میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے
وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

نے بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس کا لباس نہایت سفید اور بال
نہایت سیاہ تھے سفر کا کوئی اثر اُس پر نہ تھا۔ اور ہم میں سے کوئی شخص
اُسے پہچانتا بھی نہ تھا۔ حضرت کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گیا۔ اور دونوں
زانو پر ہاتھ رکھکر کہا۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجھے خبر دیجئے کہ اسلام کیا چیز
ہے۔ حضرت نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ کوئی معبود سوائے
اللہ کے نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز پڑھو
اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو۔ اور طاقت ہو تو حج کرو۔
کہا آپ سچ کہتے ہیں۔ ہمیں تعجب ہوا کہ سوال بھی کرتا ہے اور خود ہی
تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر کہا کہ یہ بتائیے کہ ایمان کیا چیز ہے۔ حضرت نے
فرمایا یہ کہ تم خدائے تعالے کی ذات اور ملائکہ اور اُس کی کتابیں اور
پیغمبروں کا یقین کرنا۔ اور خیر و شر اللہ ہی کے طرف سے سمجھنا۔ کہا آپ
سچ کہتے ہیں کہ پھر کہا یہ بتائیے کہ احسان کیا چیز ہے فرمایا کہ اس طرح عبادت
کرو کہ گویا اللہ کو تم دیکھ رہے ہو۔ اور اگر تم نہیں دیکھتے تو وہ تو دیکھ رہا ہے
کہا آپ سچ کہتے ہیں۔ پھر اُس نے قیامت کے حالات دریافت کئے
جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت نے پوچھا اے عمرؓ تم جانتے ہو کہ یہ کون
تھے؟ میں نے کہا اللہ و رسول دانا تر ہیں۔ فرمایا وہ جبرئیل تھے تمہیں دین
کی تعلیم کرنے کے لئے آئے تھے۔ انتہیٰ۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہے کہ اسلام احکام ظاہری بجا لانے کا نام ہے
اور احکام ظاہری بجا لانے میں جس کا دل تنگ ہو تو آیۂ موصوفہ سے ثابت
ہے کہ خدائے تعالےٰ کو اُس کی ہدایت مقصود نہیں۔ کیونکہ صاف ارشاد ہے

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام۔ ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجاً - اب اس کے بعد
کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہم درجۂ احسان میں ہیں - اس لئے عبادت ظاہری
کی بھی ضرورت نہیں - کیونکہ جب نصِّ قطعی سے ثابت ہے کہ جس پر عبادت
ظاہری آسان نہ ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ خدائے تعالےٰ اُس کو گمراہ کرنا چاہتا
ہے - اور جس کو خدائے تعالےٰ گمراہ کرنا چاہے ممکن نہیں کہ اس کو ہدایت
اور تقرب الٰہی حاصل ہو سکے - الحاصل جو عبادت مفروضہ سے محروم ہے
وہ درجۂ احسان سے بالکلیہ محروم ہے - جبرئیل علیہ السلام جو تعلیم امت کے
لئے بارگاہ الٰہی سے مامور ہو کر آئے تھے اُن کی پہلی تعلیم اسلام سے متعلق
تھی - جس کے معنی گردن نہادن اور فرماں برداری کے ہیں - اس کے بعد
ایمان کی تعلیم مقصود تھی - اُس کے بعد احسان کی تعلیم -

اس سے ظاہر ہے کہ دین میں ابتدائی درجہ اسلام ہے اور انتہائی درجہ
احسان - ابتدائی درجہ کا وجود دوسرے دونوں درجوں میں ضروریات
سے ہے - کیونکہ ایمان کے درجہ میں اگر آدمی بطور خود کسی بات پر ایمان

ایمان و احسان میں اسلام کی ضرورت

لائے تو اس کو بجائے ایمان دار کے بے ایمان کہنا چاہیئے۔ ایمان کو درجہ میں اسی قسم کا ایمان ہونا چاہیئے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے یعنی اس ایمان کے وقت آیات و احادیث کی فرماں برداری کی ضرورت ہے مثلاً خدائے تعالےٰ کے اُن صفات پر ایمان لائے جو شریعت سے ثابت ہیں۔ اگر اس میں تصرف کرے اور یہ کہے کہ فلاں صفت میں یہ قباحت لازم آتی ہے۔ اس لئے اس باب میں فرماں برداری نہیں کرسکتا تو ایسا ایمان جس کو اسلام سے تعلق نہیں وہ ایمان نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح احسان کے درجہ میں جو ارشاد ہے واعبد ربک اگر اسلام نہ ہو یعنی یہ کہے کہ فلاں عبادت جس کا حکم خدا و رسول نے کیا ہے میں نہ کروں گا اور اس میں مجھے فرماں برداری کی ضرورت نہیں تو اس کو درجہ احسان سے تعلق نہیں۔

غرض کہ اسلام یعنی فرماں برداری خدا و رسول دین کے تمامی مدارج میں ضروریات سے ہے اسی وجہ سے ارشاد ہے فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام۔

الجنۃ

جن کا وجود ہر ملت و مذہب میں ثابت ہے۔ چنانچہ دائرۃ المعارف میں معلم بطرس بستانی نے لکھا ہے کہ جتنے مذاہب انبیا کی تصدیق کرتے ہیں

وہ سب جن کے وجود کو مانتے ہیں اور قدماے فلاسفہ اور اصحابِ روحانیات بھی ان کے وجود کے قائل ہیں۔ ان کی پیدائش کی نسبت حق تعالیٰ فرماتا ہے والجان خلقناہ من قبل من نار السموم یعنی جن کو ہم نے انسان سے پہلے سموم کی آگ سے پیدا کیا۔ سموم اُس گرم ہوا کو کہتے ہیں جو آدمی کے جسم میں سرایت کرتی ہے۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ سموم میں آگ ہوتی ہے اُس کو سموم کہنے کی یہ وجہ ہے کہ بسبب کمال لطافت کے آدمی کے مسامات میں گھستی ہے۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ سموم جو بہا کرتی ہے وہ ستر حصوں سے ایک حصہ اس سموم کا ہے جس سے جن پیدا ہوئے ہیں۔

الحاصل سموم میں جو آگ پوشیدہ ہوتی ہے اُس سے حق تعالےٰ نے جن کو بنایا۔

توضیح اس کی اس طرح کی جا سکتی ہے کہ خالص آگ جہاں مشتعل ہوتی ہے وہاں ایک خاص حد تک آگ محسوس ہوتی ہے جس کو زبانۂ آتش کہتے ہیں۔ اور اُس میں جلانے کی صفت بھی محسوس ہوتی ہے۔ کپڑا وغیرہ اس پر رکھا جائے تو جل کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس حد کے بعد اُس آگ کا استحالہ ہوا کی طرف ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ ہوا بن جاتی ہے۔ مگر ایک حد تک اس ہوا میں گرمی ضرور رہتی ہے۔ اسی حد میں جس قدر گرمی محسوس ہے وہ آگ کی

گرمی ہے۔ یہی گرم ہوا جب بہکر آدمی کے مسامات میں گھس جاتی ہے تو ہلاک کر دیتی ہے۔ یہ مہلک گرمی آگ کی ہے۔ کیونکہ جو حرارت کیفیت ہوا ہے وہ مہلک نہیں بلکہ مفرح اور روح کو تازہ کرنے والی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ سموم میں آگ ہوتی ہے اسی آگ سے جن پیدا کئے گئے جس طرح مٹی سے انسان پیدا کئے گئے۔ بظاہر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ انسان مٹی سے کیونکر پیدا ہوا۔ کیونکہ ظاہرا اس کی تخلیق پانی سے معلوم ہوتی ہے جو انسان سے خارج ہوتا ہے مگر چونکہ انسان کے حالات ہمیشہ ہمارے پیش نظر ہیں اس لئے غور و فکر کرنے سے معلوم ہو گیا ہے کہ دراصل انسان کی تخلیق خاک سے ہے جس کا حال ہم نے مقاصد الاسلام کے حصۂ ہفتم میں لکھا ہے باوجود اس علم کے کیفیت تخلیق میں عقل حیران ہوتی ہے کہ مٹی کے استحالات جو ہوتے گئے وہ کیونکر ہوئے یہ بات اور ہے کہ عادت ہونے کی وجہ سے حیرانی نہیں ہوتی مگر خاک کا نبات اور نبات کا اخلاط اور اخلاط کا مضغہ بن جاتا عقل کی راہ سے ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ قلب ماہیت کیونکر ہوتی گئی خاک پر کس نے جبر کیا کہ اپنی صورت نوعیہ کو چھوڑ کر نباتی صورت اختیار کرے اور وہ خاصیتیں اور تاثیرات اُس میں آجائیں جو خاک میں نہ تھے۔ اور جسم نباتی وحیوانی پر ایسی کونسی چیز مسلط ہوی جس نے ان کی صور نوعیہ کو دور کر کے خلطی صورت پہنادی۔ اب اگر کہیں کہ صورت نباتی خلط میں

موجود ہے تو بداہت کے خلاف ہے کیونکہ اخلاط میں اس قسم کا جسم ہے نہ رنگ نہ بو ہے نہ مزہ وغیرہ اور اگر کہیں کہ صورت نباتی فنا ہو گئی تو وہ خاصیتیں اور تاثیرات جو اس میں نہیں کہاں سے آگئیں۔ کیونکہ کل لوازم و آثار صورت نوعیہ سے متعلق ہیں۔ مثلاً دماغ کی قوت کے لئے جو دوائیں دی جاتی ہیں جب تک وہ دماغ میں نہ جائیں تاثیر ممکن نہیں۔ اور دماغ میں جانے والی اس کی غذا بلغم وغیرہ ہے جس کی صورت نوعیہ ان ادویہ کی صور نوعیہ سے بالکل جدا اور ممتاز ہے۔ بہرحال اس سلسلے کے انقلابات اور استحالات کو اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو ضرور عقل حیران ہوتی ہے۔ اور جب تک اس کے قائل نہ ہوں کہ خالق عالم نے جس طرح خاک کو اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا اسی طرح صورت نوعیہ کو دور کر کے صورت ثانیہ اس کو دی۔ علیٰ ہذا القیاس یکے بعد دیگرے انقلابات ہوتے گئے یہاں تک کہ آخر میں صورت انسانی کی خلعت فاخرہ اس کو پہنایا گیا۔ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ ہر چیز کی تخلیق میں ابتدا کچھ ہوتی ہے اور انتہا کچھ۔ یہ ضرور نہیں کہ جو صورت ابتدائی ہو اس کے پورے لوازم و آثار باقی رہیں۔ دیکھئے انسان خاک سے پیدا ہوا اور خاک سے سوائے جسمیت کے اس کو کوئی مشابہت نہیں اسی طرح جن نار سموم سے پیدا ہوئے اور اس سے ان کو کوئی مشابہت نہیں۔ ان امور پر غور نہ کر کے اقسام کے اعتراض کئے جاتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ نار ایک

لطف

لطیف چیز ہے اگر جن اُس سے پیدا ہوئے ہوں تو ان کی قوت سے متعلق
جو حکایات مشہور ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آدمی سے زیادہ وزن اٹھا
سکتے ہیں درست نہ ہوگا کیونکہ جس کی جسامت زیادہ ہوگی اس کی جسمانی قوت
بھی زیادہ ہوگی یہ سب قیاس غائب علی الشاہد ہے جو بالکل صحیح نہیں جس
چیز کی تخلیق خدائے تعالے فرماتا ہے وہ نرالی ہوتی ہے۔ دیکھئے افلاک کے
نسبت حکما نے تصریح کی ہے کہ نہ وہ گرم ہیں نہ سرد نہ ثقیل نہ خفیف۔ اب
کہئے کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی چیز خفیف بھی نہ ہو اور ثقیل بھی نہ ہو
آگ ہر چیز کو جلاتی ہے مگر ابرک کو نہیں جلا سکتی سونے چاندی کو سیال
بناتی ہے اور انڈے کی زردی اور سفیدی کو جو سیال ہے منجمد کر دیتی ہے
غرض کہ ہر ایک چیز میں حق تعالے نے ایک قسم کی صلاحیت دی ہے اور
اُس کے لوازم و آثار مقرر فرمائے جن کا صدور ضروریات سے ہے اسی
طرح جن کو بھی نار سموم سے پیدا کر کے اُن کے لوازم و آثار مقرر کیا مثلاً
ہر شکل میں متشکل ہونا نظروں سے عموماً غائب رہنا اور کبھی بعض بعض لوگوں کو
نظر آجانا تھوڑے عرصہ میں مسافت بعیدہ کو طے کرنا انسان کے جسم میں حلول
کرنا وغیرہ۔ ہم نے مقاصد الاسلام کے دوسرے حصہ میں کتب حکمت
جدیدہ سے جن کا وجود بفضلہ تعالیٰ ثابت کر دکھایا ہے۔ اگر وہ تقریر
دیکھ لی جائے تو اہل انصاف کو غالباً جن کے وجود میں کوئی شک و شبہ باقی

نہ رہے گا۔

جزو جسم انسان

علامہ فرید وجدی نے کنز العلوم واللغہ میں لکھا ہے یہ امر مکرر تجربہ اور تحقیقات سے یورپ میں مسلم ہو چکا ہے کہ روحیں (جن) بلائے جاتے ہیں اور وہ بالکل آدمی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ ان میں گوشت خون ہڈی وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں اور جب ان سے دریافت کیا گیا کہ یہ اشیا تم میں کہاں سے آ گئے تو انہوں نے خبر دی کہ وہ سب عاریتی ہیں اس شخص سے لیتے ہیں جو ہمیں بلاتا ہے۔ چنانچہ بلانے والے کا وزن کیا گیا تو فی الواقع اس کا نصف وزن کم تھا۔ اور ان کے جانے کے بعد جب تولا گیا تو اس کا اصلی وزن پورا ہو گیا۔ دیکھئے ان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی کہ آدمی کی ہڈی اور گوشت وغیرہ چرا لیں اور اس کو خبر نہ ہونے پائے یہ بات نہ آدمی کو دی گئی نہ کسی جانور کو۔ اب کہاں ہے وہ قاعدہ جو ہزارہا اطبا کے تجربوں اور اقوال سے ثابت تھا کہ اذیت کا باعث تفرق اتصال ہے یہاں تو سر سے پاؤں تک ہر ہر ہڈی گوشت وغیرہ میں تفرق اتصال ہو گیا۔ اور وہ بھی کیسا کہ صرف تفرق ہی نہیں بلکہ ہر ایک چیز آدھی آدھی ہو کر جسم سے باہر نکل گئی اور پوست صحیح و سالم رہا اور خبر بھی نہ ہوئی کہ کوئی چیز اپنے جسم سے خارج ہوئی یا نہیں کیونکہ گوشت اور پوست اپنی حالت سابقہ پر ہے اگر ہڈی باہر نکل جاتی تو گوشت اور پوست ضرور پھٹتا جس سے ایک دوسرا

۹۰۴

تفرق اتصال ہو کر اذیت پر اذیت ہوتی ہے۔ اب کہئے کہ اس قسم کی چوری گیا کوئی انسان یا حیوان کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ خاص جنّوں ہی سے متعلق ہے اس قسم کے صدہا عجائبات ان سے ظہور میں آتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب کبھی کوئی نیا تجربہ کیا جاتا ہے تو نئی نئی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں جن سے عقل حیران ہو جاتی ہے۔

یہاں یہ امر خاص توجہ کے لائق ہے کہ جس انسان سے ہڈی گوشت وغیرہ چرایا گیا اُس کا وجدان گواہی دیتا ہے کہ جس قدر جسم چوری سے پہلے اپنے پاس تھا اب بھی ہے کوئی جزو اس میں سے کسی دوسرے کے جسم میں نہیں گیا اور حس بھی گواہی دیتی ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں اور عقل بھی گواہی دیتی ہے کہ کوئی جزو اندر سے باہر چلا نہیں گیا۔ ورنہ حس کا امان جاتا رہے گا جس سے لازم آئیگا کہ کوئی دلیل ثابت نہ ہونے پائے کیونکہ جب تک نظریات کی انتہا بدیہیات پر نہ ہو وہ ثابت نہیں ہو سکتے پھر جب حواس ہی کا اعتبار نہ رہے اور یہ مسلم ہو جائے کہ وہ اپنے کام میں غلطی کرتے ہیں۔ مثلاً آدھا جسم کسی نے آنکھوں کے سامنے سے چرا لے گیا اور اُن کو خبر بھی نہ ہوی۔ حالانکہ سوئی کے چبھنے سے ایک بال برابر جسم میں تفرق اتصال ہو جاتا ہے تو سر سے پاؤں تک بیقراری ہوتی ہے بمصداق

شعر۔ چو عضوے بدرد آورد روزگار ✤ دگر عضوہا را نماند قرار

جب سر سے پاؤں تک ہر ایک عضو میں تفرق اتصال ہو جائے اور قوت احساسی کو خبر تک نہ ہو تو کہیے کہ اب کس چیز پر بھروسہ ہو سکے عقل اس قابل نہ تھی کہ اُس پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ نظر و فکر میں ہمیشہ غلطیاں ہوا کرتی ہیں اسی وجہ سے کوئی عقلی مسئلہ ایسا نہیں جس میں عقلا کا اختلاف نہ ہو۔ صرف حواس اعتبار کے قابل سمجھے جاتے تھے جب ان کا بھی یہ حال ہو تو اب کس چیز کے اعتماد پر کوئی بات ثابت ہو سکے۔ غرض کہ یہاں وجدان۔ حس اور عقل کی گواہی سے پورا جسم اپنے مقام میں رہنا ثابت ہے اور آدھے جسم کا غیب ہو جانا بھی مشاہدہ سے ثابت ہو گیا تو اب عقل سے پوچھا جائے ان دونوں صورتوں میں کونسی صورت اختیار کی جائیگی جو کوئی اختیار کیجائے اُس کے مقابلہ میں دوسری صورت موجود ہے جو اعتبار میں اس سے کم نہیں۔

دائرۃ المعارف میں فاضل فرید وجدی نے لکھا ہے کہ یہ مسئلہ امریکہ میں ۱۸۴۶ء میں اور یورپ میں شایع ہونے لگا تو ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ مادئیین کے الحاد و زندقہ کا مدار اس ہٹ دھرمی پر تھا کہ اگر جن موجود ہیں یا ارواح بعد موت باقی رہتے ہیں تو بتائی جائیں اور اہل مذہب بتا نہیں سکتے تھے۔ اور اب یہ دعوے سے کہا جا رہا ہے اور دعوتیں دی جا رہی ہیں کہ جس کو وجود جن و ارواح میں شک ہو تو آکر

دیکھ لیں تو اب اہل مذہب کے مقابلے میں ماڈیین حیران ہیں اور کبھی
چڑ میں آکر سخت و سُست کہنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ مار پیٹ بلکہ جدال
و قتال کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ مگر تابکے آخر اہل انصاف کرّات و مرّات
کے مشاہدہ سے قائل ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت لاکھوں علمائے
یورپ نے مان لیا کہ ارواح و جن کے وجود میں اب کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔
اور ان کے احوال و افعال میں عقل بالکلیہ حیران ہے جس کا جسم چرا یا
جائے وہ سمجھتا ہے کہ میرا جسم میرے پاس موجود ہے اور حالانکہ اسی کا
جسم اُس جن کے پاس ہے۔ اور دونوں جگہ کام دے رہا ہے۔ جب
یہ مشاہدہ سے ثابت ہو گیا اور لاکھوں عقلا نے اس کو تسلیم کر لیا تو اُن
وقائع کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ
وقت واحد میں کئی جگہ جا سکتے ہیں۔ امام سیوطی رح نے القول المنجلی
فی تطور الولی میں لکھا ہے کہ ایک مسئلہ میرے پاس پیش ہوا۔ کہ ایک
مجلس میں کسی نے کہا آج رات شیخ عبد القادر طحطوطی رح میرے یہاں تشریف
لائے تھے اور رات بھر رہے دوسرے نے کہا کہ یہ کیا کہتے ہو وہ تو رات
بھر میرے یہاں تھے اُس نے کہا غلط کہتے ہو۔
غرضکہ طرفین سے گفتگو بڑھی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ دونوں
نے قسم کھائی کہ اگر وہ بزرگ آج رات میرے یہاں نہ تھے تو میری بیوی کو

اولیا کا وقت واحد میں متعدد مقامات میں ہونا

طلاق - اور فیصلہ اس پر ٹھیرا کہ خود انہی حضرت سے پوچھ لیا جائے کہ آپ کہاں تھے - جب پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر چار شخص بھی دعوی کریں کہ ہمارے پاس تھا تو وہ صحیح ہے - علما میں گفت گو شروع ہوئی کہ کس کی بیوی پر طلاق واقع ہوئی - امام سیوطی رحمہ نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی پر طلاق نہیں ہوئی - کیونکہ ایک شخص وقت واحد میں کئی مقامات میں کرامت سے رہ سکتا ہے - اس کے بعد اسی میں لکھا ہے کہ تاج الدین سبکی رحمہ نے طبقات کبریٰ میں ابو العباس رحمہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ صاحب کرامات تھے - ان کے شاگرد عبد الغفار رحمۃ اللہ علیہ کتاب وحید التوحید میں لکھتے ہیں کہ جمعہ کے روز ہم شیخ کی خدمت میں حدیث پڑھ رہے تھے - اور ان کی باتوں پر ہمیں لذت حاصل ہوتی تھی - ایک لڑکا وضو کرنے لگا - شیخ نے کہا - اے مبارک - کہاں جاؤگے - کہا مسجد کو - فرمایا - قسم ہے میں نے نماز پڑھ لی - لڑکا جب مسجد کو گیا تو لوگ نماز پڑھ کے مسجد سے نکل رہے تھے - عبد الغفار کہتے ہیں کہ میں نے بھی نکل کر لوگوں سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ شیخ ابو العباس مسجد میں ہیں - اور لوگ ان پر سلام کر رہے ہیں - یہ سن کر میں نے شیخ کے پاس آکر حال دریافت کیا - فرمایا کہ مجھے قوت تبدل صورت دی گئی اور لکھا ہے کہ صفی الدین بن ابی المنصور نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ شیخ مفرج کا عجیب واقعہ یہاں گزرا کہ

ایک شخص

ایک شخص نے حج سے آکر اپنے احباب میں ذکر کیا کہ شیخ مفرج کو میں نے
عرفات میں دیکھا۔ دوسرے نے کہا وہ تو دمامین سے کہیں نہیں گئے دونوں
میں گفتگو یہاں تک بڑھی کہ ایک نے قسم کھائی اور کہا اگر میں جھوٹ کہہ رہا
ہوں تو میری عورت پر طلاق۔ دونوں نے شیخ کے پاس جاکر کہا کہ ہم دونوں
نے اس معاملہ میں طلاق کی قسم کھائی ہے۔ فرمایا کسی کی عورت پر طلاق نہیں
پڑی۔ میں نے پوچھا کہ جب ایک شخص سچا ہے تو دوسرے کی عورت
پر ضرور طلاق پڑھنی چاہئیے۔ اُس وقت مجلس میں بہت سے علما حاضر
تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں تم لوگ گفتگو کرو۔ ہر ایک نے اپنی اپنی
رائے بیان کی۔ مگر تشفی نہ ہوئی۔ آخر میں مجھ سے فرمایا کہ تم وضاحت سے
بیان کرو۔ میں نے کہا جب کسی کی ولایت متحقق ہو جاتی ہے تو وہ ہر صورت
کے ساتھ متشکل ہو سکتا ہے۔ اور اپنی روحانیت کی وجہ سے متعدد جہات
میں وقت واحد میں جا سکتا ہے۔ اور یہ سب کام اس کے ارادہ سے ظہور میں
آتے ہیں۔ اس وجہ سے جو صورت کہ عرفات میں دیکھی گئی حق تھی۔ اور جو
صورت کہ دمامین میں دیکھی گئی وہ بھی حق تھی۔ شیخ نے فرمایا یہی بات صحیح ہے
اور امام یافعی رح کا قول نقل کیا ہے کہ اس قسم کی بات بعید نہیں ہے
فقہا نے تصریح کی ہے کہ کعبہ معظمہ کو لوگوں نے دیکھا ہے کہ بعض اولیا اللہ
کے طواف کے لئے گیا۔ حالانکہ اُس وقت وہ مقام سے منتقل نہیں ہوا تھا

اور لکھا ہے کہ شیخ خلیل مالکی جو امام سمجھے جاتے تھے اور جلالت شان ان کی مسلم ہے انہوں نے لکھا ہے کہ ایک جماعت سے منقول ہے کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ کعبۃ اللہ نے بعض اولیاء اللہ کا طواف کیا ہے۔

اور لکھا ہے کہ بعض بزرگوں سے ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ لوگ جو ہوا پر اڑنے کو بڑی بات سمجھتے ہیں وہ کوئی بڑی بات نہیں۔ البتہ بڑی بات یہ ہے کہ ایک شخص مشرق میں ہو اور دوسرا شخص مغرب میں۔ اور دونوں کو باہمی ملاقات کی خواہش ہو۔ اور دونوں ایک جگہ جمع ہوں اور ملاقات کرکے واپس آجائیں۔ اور لوگ ان کو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھیں۔ یعنی اپنے مقاموں میں بھی موجود رہیں اور دوسری جگہ بھی جائیں۔

اور لکھا ہے کہ امام یافعی رح نے روض الریاحین میں ذکر کیا کہ ایک شخص حج سے فارغ ہو کر جب گھر آیا تو باتوں باتوں میں اپنے بھائی سے کہا کہ اس سال سہل ابن عبداللہ بھی حج میں شریک تھے۔ اور عرفات کے موقف میں میں نے انہیں دیکھا۔ اس نے کہا وہ تو یوم الترویہ یعنی ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ اپنی رباط میں تھے جو تستر کے دروازہ پہ ہے۔ اس نے کہا میں نے ان کو عرفات میں ضرور دیکھا ہے۔ اگر یہ خلاف ہے تو میری عورت پر طلاق دونوں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا۔ شیخ نے

تصدیق کر کے کہاں امور کی دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور قسم کھانے والے سے فرمایا کہ تمہاری عورت پر طلاق نہیں ہوئی۔ اور کسی سے یہ حال بیان نہ کرنا۔ اور لکھا ہے شیخ خلیل مالکی رح نے بھی اپنی کتاب میں کہ شیخ عبد اللہ متوفی کا بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے اور کہتا ہے کہ شیخ ابو العباس موسیٰ رح کے حال میں لکھتے ہیں کہ کسی شخص نے آپ کو جمعہ کے روز بعد نماز جمعہ اپنے گھر بلایا آپ نے قبول کیا اُس کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ شخصوں نے جمعہ کے بعد اپنے گھر آنے کو کہا آپ نے سب کو اچھا کہا۔ جب جمعہ کی نماز سے فارغ ہوئے تو اپنے مکان میں تشریف لا کر فقرا کے ساتھ حسب عادت تشریف رکھے۔ اور کہیں نہ گئے۔ اُس کے بعد پانچوں نے آ کر تشریف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔ اور لکھا ہے کہ شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ کے شاگردوں سے ایک شخص حج کو گیا جب واپس آیا تو شیخ کا حال دریافت کیا لوگوں نے کہا خیریت سے ہیں۔ پھر کہا وہ بھی اس سال حج میں شریک تھے۔ چنانچہ میں نے شیخ کو "مطاف" اور "مسعیٰ" و "عرفات" وغیرہ مقامات میں دیکھا۔ لوگوں نے کہا وہ تو یہاں سے کہیں نہیں گئے۔ وہ شخص شیخ کی ملاقات کو گیا۔ شیخ نے اثنائے کلام میں پوچھا کہ سفر میں کن کن بزرگوں کو تم نے دیکھا۔ کہا حضرت میں نے تو آپ کو بھی دیکھا ہے۔ شیخ نے تبسم فرمایا۔

اور لکھا ہے کہ شیخ عبد القادر جیلانی رح سے قضیب البان موصلی رح

کا حال دریافت کیا گیا۔ فرمایا وہ ولی مقرب و صاحب حال و قدم صدق ہیں۔ کسی نے کہا۔ ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ اُنھوں نے نماز پڑھی ہو۔ فرمایا وہ وہاں نماز پڑھتے ہیں۔ تم اُن کو نہیں دیکھ سکتے۔ میں انہیں دیکھتا ہوں۔ کہ موصل میں یا اور کسی شہر میں نماز پڑھتے ہیں تو وہ باب کعبہ پر سجدہ کرتے ہیں۔

ابوالحسن قرشی کہتے ہیں کہ میں ایک بار قضیب البانؒ کی ملاقات کو گیا۔ دیکھا اُن کا جسم اس قدر بڑا ہے کہ تمام گھر ان سے بھر گیا۔ میں یہ دیکھکر ڈر گیا پھر جب دوبارہ گیا تو اپنی اصلی حالت پر ہیں۔

اور لکھا ہے کہ شیخ برہان الدین رحؒ انباسی نے اپنی کتاب تلخیص الکواکب المنیر میں لکھا ہے کہ جب شیخ ابوالعباس رحؒ مکہ معظمہ کو گئے تو حرم شریف میں شیخ ابوالحجاج اقصری سے ملاقات ہوی۔ اور اولیاء اللہ کا ذکر خیر دیر تک ہوتا رہا۔ ابوالحجاج رحؒ نے کہا کیا طواف کعبہ کی خواہش ہے۔ ابوالعباسؒ نے کہا کہ خدائے تعالےٰ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ اُس کا گھر ان کا طواف کرتا ہے۔ ابوالحجاج نے جو نظر اُٹھا کر دیکھا تو فی الواقع بیت اللہ اُن دونوں کی طراف طواف کر رہا ہے۔

انباسی رحؒ نے لکھا ہے کہ یہ کوئی انکار کے قابل بات نہیں۔ اس کی نظیریں اخبار صالحین میں بہت سی ملتی ہیں۔

اور لکھا ہے

اور لکھا ہے کہ ابن قیم رح کتاب الرّوح میں لکھتے ہیں کہ روح کی وہ شان
ہے کہ بدن کو حاصل نہیں۔ چنانچہ رفیق اعلیٰ میں رہتی ہے۔ اور اسی حال
میں بدن کے ساتھ بھی اُس کو اتصال ہوتا ہے۔ اس طور پر کہ جب اس پہ
سلام کیا جائے تو جواب سلام دیتی ہے۔
جب یہ بات مسلم ہوی کہ کرامت سے ایک شخص متعدد مقامات میں ہو
سکتا ہے تو اس سے ایک بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ وہ یہ ہے کہ احادیث
صحیحہ میں وارد ہے کہ ایک ایک جنتی کو اتنے باغ دئے جائینگے جو زمین
و آسمان کے برابر ہوں۔ مطلب یہ کہ تمام روئے زمین کی سلطنت کے
مقابل ہر شخص کو وہاں سلطنت دی جائے گی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آدھی
بلکہ پاؤ زمین بھی سرسبز نہیں ہے اور اس میں باغ تو شاید لاکھوں حصّہ بھی
نہ ہوں گے۔ بخلاف جنت کے کہ اُس کی شان میں حق تعالےٰ نے فرمایا ہے
وجنات الفافا یعنی کثرت اشجار والی جنتیں پھر صرف باغات ہی
نہیں بلکہ عیش و عشرت کے جملہ سامان موقع موقع پر مہیا اور موتیوں وغیرہ
کے محل اور اون میں حور و غلمان وغیرہ موجود ہوں گے۔ غرض کہ ایک شخص
کے واسطے ایک اتنا بڑا ملک جس کی شان میں حق تعالےٰ و ملکا
کبیرا فرماتا ہے۔ معین فرمایا گیا ہے۔ اگر تھوڑی تھوڑی دیر ایک ایک
خطّہ اور مکان میں سیر و تفریح ہو تو تمام ملک کی گشت کرنے کے لئے ایک

مدت دراز در کار ہے۔ پھر جس چیز کو دیکھئے دلچسپ و دلفریب۔ اور
قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی مقام یا کوئی چیز پسند آجاتی ہے تو اُس کے
چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ع

نگاہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اس لحاظ سے تو ہر مقام اور ہر چیز اپنے ہی پاس اقامت کرنے پر مجبور
کریگی۔ اور تمام سلطنت کے اشیاء کا وجود اس شخص کے حق میں بیکار
ہوگا۔ حالانکہ وہاں کے کل اشیاء خاص اُسی کے انتفاع کے واسطے
ہیں۔ مگر جب ہمیں معلوم ہوا کہ کرامت سے ایک آدمی اس عالم میں متعدد
مقامات میں وقت واحد رہ سکتا ہے تو جنت تو خاص دارالکرامت ہے وہاں
جس قدر کرامات اور اقتدارات مسلمانوں کو دئے جائیں گے ان کا شمار
نہیں۔ اس صورت میں یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ
ہر مقام میں جنتی اپنی ذات سے رہ سکیگا اور کوئی چیز اس کے حق میں
بیکار ثابت نہ ہوگی۔

پلصراط کا باریک اور کشادہ ہونا

یہاں ایک اور مسئلہ حل ہوگیا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ پلصراط
بعض کے واسطے بال سے باریک ہوگی اور بعض کے حق میں کشادہ میدان
کیونکہ یہ ثابت ہوگیا کہ ایک معین چیز وقت واحد میں کئی مقامات میں
ہوسکتی ہے۔ پھر کیا تعجب کہ ایک مقام میں نہایت باریک ہو اور دوسرے

مقام میں

مقام میں نہایت وسیع اور دونوں بوحدت شخصی ایک ہوں۔ جب "جن" کا
وجود مشاہدہ سے ثابت ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اُن کے احوال نرالے ہیں
انسانوں پر اُن کا قیاس نہیں ہوسکتا تو اب اُن مشاہدات سے انکار کی
کوئی ضرورت نہ رہی جو متواتر ثابت ہیں کہ وہ کبھی نظر آتے ہیں اور اُن کا
مختلف صورتیں بدلنا محسوس ہوتا ہے مثلاً کتے یا بلی کی صورت میں دکھائی
دیتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی مہیب قد آور آدمی بن گئے۔ جب کوئی اپنے چشم دید
واقعات اس قسم کے بیان کرتا تو کہا جاتا تھا یہ سب خیالی اور وہمی صورتیں
ہیں جن کو خارج میں کوئی اصل نہیں۔ حالانکہ ان امور کی اصلیت اب
ثابت ہو چکی ہے۔ اب بھی شاید بعض لوگوں کے سمجھ میں یہ نہ آئیگا کہ
اگر وہ ایسے اجسام ہیں جو دکھ نہیں سکتے تو پھر اُن کا دکھنا کیسا؟ اور اشکال
کے بدلنے میں بڑے بڑے اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ مگر غور کیا جائے
تو اس کا سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں۔ حق تعالے نے جس چیز کو پیدا کیا اس کے
اوصاف و احوال خاص خاص قسم کے معین کئے جو ہمیشہ ایک طور پر دیکھے
جاتے ہیں اس وجہ سے جب اُس چیز کا خیال آئیگا تو وہی احوال و اوصاف
پیش نظر ہو جائینگے۔
دیکھئے اگر کوئی مسلمان ہمیشہ داڑھی منڈواتا ہو تو جب اُس کا خیال آئیگا
تو اُس کے چہرہ کے ساتھ ڈاڑھی کبھی خیال میں نہ آسکے گی اور اگر بتکلف

اُس کا خیال کیا جائے تو وہ ایسا ہوگا جیسے کسی عورت کے چہرہ کے ساتھ
ڈاڑھی کا خیال کیا جائے - اگرچہ دونوں کی ڈاڑھیوں میں فرق ہے عورت کی
فطرت میں داڑھی نہیں رکھی گئی اور مرد کی فطرت میں داڑھی ہے مگر بتکلف
خواہ اس خیال سے کہ عورتوں کے ساتھ مشابہت ہو یا اور کسی وجہ سے
وہ نکال دی گئی مگر دونوں تصور کے وقت اس بات میں برابر ہیں یعنی جس طرح
عورت کے تصور کے وقت داڑھی خیال میں نہیں آتی - اسی طرح اُس مرد ریش
تراش کے تصور کے وقت بھی ڈاڑھی خیال میں نہ آئیگی - کیونکہ عادت کی وجہ
سے خیال اُس کی ڈاڑھی کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا - ہرچند اُس کے چہرہ
میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ ڈاڑھی نکل آئے - مگر اُس کی تصوری صورت
میں صلاحیت داڑھی کی نہیں ہے - باوجود اس کے اگر اُس پر یہ خیال غالب
ہو جائے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ڈاڑھی رکھتے تھے اور
اُس کے منڈوانے سے منع فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ جو شخص کسی قوم کی مشابہت
پیدا کرے وہ اُسی قوم میں ہوگا جس کے ساتھ اُس نے مشابہت پیدا کی
پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے افعال پر مطّلع ہوتے ہیں اور بحسب
اعتقادِ اہل سنت ہمیں دیکھتے بھی ہیں جب حضرت ہماری صورتوں کو مخالفین
اسلام کی طرح بے داڑھی دیکھتے ہوں گے تو کس قدر رنج ہوتا ہوگا کہ اپنی
امت کے لوگ مخالفین میں شمار کئے جائیں اور قیامت میں حضرت کو کیا منھ

بتائیں گے۔ غرضکہ اس قسم کے خیالات سے اگر وہ شخص ڈاڑھی رکھ لے تو لوگوں کو تعجب ضرور ہوگا۔ اور کوئی رودار شخص ہو تو اُس کے احباب متحیر ہوکر دیکھنے آئیں گے۔ اُن میں دیندار لوگ مبارکباد دیں گے۔ اور جن کو دین سے چنداں تعلق نہیں وہ نفرین کرینگے۔ فرشتے جو مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں خوش ہوں گے اور شیاطین ناخوش اور غمگین غرض کہ ترک عادت کی وجہ سے حیرت ضرور ہوگی۔ مگر یہ نہ سمجھا جائیگا کہ اُس شخص کی ڈاڑھی غیر ممکن تھی وہ تو مرد ہے بعض عورتوں کو بھی ڈاڑھی نکلتی ہے۔ چنانچہ خود میں نے ایک ڈاڑھی والی عورت دیکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مقتدر شخص کسی بات کی عادت کرلے تو یہ لازم نہیں کہ اُس عادت کو ترک کرنے پر وہ قادر نہ ہو۔ جس طرح شخص ریش تراش ترک عادت پر قادر ہے۔ اسیطرح خدائے تعالےٰ نے جن جن اشیاء میں ایک ایک عادت خاص طور پر رکھی ہے اوس عادت کی ترک پر قادر ہے۔ اسی کو خرق عادت کہتے ہیں۔ لوگوں نے خرق عادات کو ایک بڑی بات بنا رکھی ہے۔ مگر در اصل خدائے تعالےٰ کے نزدیک عادت اور خرق عادت دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ جب یہ امر مسلم ہے کہ خدائے تعالےٰ نے پانی میں سردی اور آگ میں گرمی اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا کی ہے تو اگر پانی میں گرمی اور آگ میں سردی پیدا کرے تو کونسی بڑی بات ہے۔ نفس تخلیق دونوں کی

برابر ہے یہ ہرگز ثابت نہ ہو سکیگا کہ پانیکی صورت نوعیہ کو سردی کے ساتھ
کوئی خصوصیت ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ گرم کبھی نہ ہوتا۔ حالانکہ ہم دیکھتے
ہیں کہ اُس میں گرمی اسقدر پیدا ہو سکتی ہے کہ آگ کی طرح وہ بھی جلا دیتا ہے
غرض کہ پانیکی سردی اور آگ کی گرمی صرف عادت کی وجہ سے خیال میں
آتی ہے۔ اس کو صورت نوعیہ سے کوئی ذاتی تعلق نہیں۔
اس تقریر کے بعد میری دانست میں یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائیگا کہ "جن"
کی تخلیق خاص طور پر جداگانہ ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ آدمی کے پورے
لوازم و اوصاف اُن میں ہوں۔ اور آدمی پر انکا قیاس کرکے اُن کے
خصوصیات سے انکار کر دیا جائے۔ آکام المرجان میں لکھا ہے کہ حارث
محاسبی رح کا قول ہے کہ مسلمان جن و انس جب جنت میں داخل ہونگے
تو آدمی جنوں کو دیکھیں گے اور جن آدمیوں کو نہ دیکھ سکیں گے۔ دیکھئے
اس مقام کے لوازم و آثار ہی جدا ہو گئے کہ انسان کی بصارت میں
ایسی صلاحیت دی جائے گی کہ جنوں کو دیکھ سکیں گے۔ کیوں نہ ہو جب
خدائے تعالیٰ کو دیکھنے کی صلاحیت اُن کے آنکھوں میں دی جائے گی
تو جن کا دیکھنا کونسی بڑی بات ہے حق تعالیٰ فرماتا ہے وجوہ یومئذٍ
ناضرۃ الیٰ ربہا ناظرۃ جس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ
کی رؤیت جنت میں ہوگی۔ اور احادیث میں تصریح اس امر کی ہے کہ

وہاں حق تعالیٰ کو اس طرح دیکھیں گے جیسے کوئی چودہویں رات کے چاند
کو دیکھتا ہے۔ آکام المرجان میں ابن عبد السلام کا قول نقل کیا ہے کہ
روئیت الٰہی فقط مسلمان اور مومنوں کو ہوگی۔ اُن کے سوا نہ جن کو ہوگی
نہ ملائکہ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرافت خاص انسان ہی کے واسطے
ہے کیونکہ وہ خلیفۃ اللہ ہے جن کو دنیا میں بہت سی باتوں میں انسان
پر فوقیت تھی اس کا معاوضہ آخرت میں اسی وجہ سے دیا گیا کہ اُن تمام
فضیلتوں سے جو وہاں دی جائینگی ابدالآباد متصف رہے۔

درازیٔ عمر جن

جنوں کی عمریں بہت دراز ہوتی ہیں۔ چنانچہ آکام المرجان میں لکھا ہے کہ
عمر بن عبد العزیز کسی جنگل میں جارہے تھے کہ ایک سانپ پر ان کی نظر
پڑی جو مرگیا تھا۔ اُس کو کفن پہنا کر دفن کر دیا۔ غیب سے آواز آئی کہ اے
سرق میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود میں نے
سنا ہے کہ تمہیں فرماتے تھے کہ تم ایک جنگل میں مروگے۔ اور ایک مرد
صالح جو اس زمانہ میں بہترین اہل ارض سے ہوگا تمہیں کفن پہنا کر دفن
کریگا۔ عمر ابن عبد العزیز نے اُس کہنے والے سے پوچھا کہ خدا تم پر رحم
کرے۔ تم کون ہو۔ کہا۔ میں ایک جن ہوں۔ اُن جنوں سے جنہوں نے
قرآن شریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ اُن لوگوں سے
سوائے میرے اور سرق کے اب کوئی باقی نہیں۔ اور سرق یہی ہے جس کو

آپ نے کفن پہنا کر دفن کر دیا انتہےٰ ۔

دائرۃ المعارف میں معلم بطرس بستانی نے لکھا ہے کہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا ۔ جب حضرت مکہ معظمہ کے پہاڑوں سے خارج ہو گئے تو ایک بوڑھے کو دیکھا لکڑی ٹیکتا ہوا آرہا ہے ۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ یہ چال اور آواز جن کی ہے ۔ اس نے کہا درست ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ جن کے کس قبیلہ سے ہو ۔ کہا ۔ صاصہ ابن الہیم بن لاقیس بن ابلیس ۔ فرمایا اس سے تو معلوم ہوا کہ تجھ میں اور ابلیس میں دو ہی پشت ہیں ۔ کہا ۔ جی ہاں ۔ فرمایا کتنی مدت تجھ پر گذری ۔ کہا ۔ تقریباً ساری دنیا کو کھا گیا ۔ جس زمانے میں قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا اس وقت میں ٹیلوں پر چڑہ کر دیکھتا اور لوگوں کو ورغلاتا تھا ۔ فرمایا ۔ یہ بڑا کام ہے ۔ کہا ۔ یا رسول عتاب نہ فرمائے ۔ میں ان لوگوں سے ہوں جو نوح علیہ السلام پر ایمان لائے میں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور ہود علیہ السلام سے ملا اور ان پر ایمان لایا ۔ اور ابراہیم علیہ السلام سے ملا ۔ اور آگ میں ان کے ساتھ تھا ۔ اور جب یوسف علیہ السلام کنویں میں ڈالے گئے میں ان کے ہمراہ تھا ۔ اور شعیب اور موسےٰ علیہما السلام سے ملاقات کی اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی ملاقات سے مشرف ہوا انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے

ملاقات ہو تو میرا اسلام ان کو پہنچانا۔

چنانچہ یہ پیام میں نے آپ کو پہنچا دیا۔ اور آپ پر ایمان لایا۔ حضرتؐ نے
فرمایا۔ اب تم کیا چاہتے ہو۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے توریۃ کی اور عیسیٰ علیہ السلام
نے انجیل کی مجھے تعلیم کی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ قرآن کی تعلیم فرمائیں
چنانچہ حضرتؐ نے قرآن کی اونکو تعلیم کی انتہی۔ آکام المرجان میں ابن عقیل
کی کتاب الفنون سے نقل کیا ہے کہ ہمارے بغداد کے محلہ ظفریہ میں
ایک گھر تھا جس میں کوئی رہ نہیں سکتا تھا۔ بہت سے لوگ رات کو
رہے۔ اور صبح کو مردہ پائے گئے۔ ایک شخص نے وہ مکان کرایہ پر لیا
ہر چند لوگوں نے منع کیا مگر نہ مانا۔ اور اس میں اتر پڑا۔ لوگ صبح ہی اسکی
حالت دریافت کرنے گئے تو وہ صحیح سالم تھا۔ اور ایک مدت تک اس میں
رہا لوگوں نے کیفیت دریافت کی تو کہا کہ میں نے جب عشا کی نماز
اس میں پڑھی اور تھوڑا سا قرآن پڑھا تو ایک جوان کنویں میں سے نکلا
اور مجھپر سلام کیا۔ میں سخت پریشان ہوا۔ اس نے کہا کہ ڈرو مت میں چاہتا
ہوں کہ تم سے قرآن پڑھوں۔ چنانچہ میں نے پڑھانا شروع کیا ایک روز
اس سے پوچھا کہ اس گھر کے واقعات جو لوگ بیان کرتے ہیں اس کی
حقیقت کیا ہے کہا کہ ہم لوگ مسلمان جن ہیں نماز قرآن پڑھتے ہیں
اس گھر کو اکثر فساق کرایہ سے لیکر اس میں شراب خواری کیا کرتے تھے

اس وجہ سے ہم اُن کو مار ڈالتے تھے۔ میں نے کہا کہ مجھے رات کو آپ سے خوف ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ دن کو تشریف لایا کریں۔ کہا۔ اچھا۔ اور ہر روز دن کو کنویں سے نکل کر میرے پاس آتا۔ ایک روز وہ پڑھ رہا تھا کہ راستہ میں کسی نے کہا کہ کیا کسی کو بدنظری اور جن کا علاج کرانا ہے؟ مجھ سے اُس نے پوچھا یہ کیا ہے۔ میں نے کہا یہ عامل ہے۔ جن کو اُتارتا ہے کہا۔ اُس کو بلا لو جب میں نے اُس کو بلایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ غائب ہے اور ایک بڑا سانپ چھت پر جا رہا ہے وہ عامل کچھ پڑھنا شروع کیا۔ جس سے وہ سانپ لٹکنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ اُس رومال میں گرا جسے وہ پہلے سے بچھا رکھا تھا۔ وہ اُٹھا اور اُسے زنبیل میں داخل کرنا چاہا۔ میں نے منع کیا۔ اُس نے کہا کیا مجھے اپنے شکار کو لے جانے سے روکتے ہو۔ میں نے ایک دینار دیکر اُسے رخصت کیا۔ سانپ حرکت کرکے اپنی شکل سابقہ پر ہو گیا مگر اسکی حالت نہایت متغیر تھی۔ میں نے کہا تمہاری کیا حالت ہے۔ کہا اُس شخص نے چند اسمار پڑھکر مجھے مار ڈالا۔ مجھے امید نہیں کہ میں جانبر ہو سکوں۔ تم اس کنویں کے طرف کان لگائے رکھو۔ اگر اس سے چیخ کی آواز آئے تو یہاں سے فوراً بھاگ جانا چنانچہ رات کو میں نے آواز سنی اور فوراً بھاگ گیا۔ انتہی

ابن عقیل نے لکھا ہے کہ اُس کے بعد اُس مکان میں پھر کوئی نہ رہا

اس سے ظاہر ہے کہ اسما اُن میں ایسی تاثیر کرتے ہیں جیسے زہر انسان
میں۔ اور آکام المرجان میں یہ روایت نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ ایماندار اپنے شیطان کو ایسا دُبلا کرتا ہے جیسے کوئی سفر
میں اونٹ کو۔

قیس بن حجاج کہتے ہیں کہ میرے شیطان نے ایک روز میرے سے
کہا کہ جب میں تم میں داخل ہوا تھا تو اونٹ کے جیسا تھا۔ اور آج میری
یہ حالت ہے کہ چڑیا کے مثل ہو گیا ہوں۔ میں نے کہا یہ کیوں۔ کہا۔ کہ تم
قرآن پڑھکر مجھے گلاتے رہتے ہو۔ انتہیٰ۔

یہ اُن شیاطین کا حال ہے جو ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں جسکو
قرین کہتے ہیں۔ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ ہر انسان کا ایک
قرین جن سے ہوتا ہے جو کافر ہوتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا کیا وہ آپکے بھی
ساتھ ہے۔ فرمایا ہاں مگر میرا قرین مسلمان ہو گیا ہے۔

اور ایک روایت ہے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ
آدم علیہ السلام پر مجھے دو باتوں میں فضیلت ہے۔ ایک یہ کہ میرا شیطان
کافر تھا۔ حق تعالےٰ نے میری مدد کی یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گیا
اور میری بیویاں میری مدد کرتی ہیں۔ بخلاف آدم علیہ السلام کے کہ
اُن کا شیطان کافر تھا اور اُن کی بیوی نے خطا پر اُن کی مدد کر کے

اُنہیں ضرر پہنچایا۔
الحاصل جن خواہ قرین ہو یا نہ ہو اُس کے جسم میں اسما کی تاثیر ہوتی ہے بخلاف دوسرے انواع و اجناس کے آکام المرجان میں روایت ہے کہ زبیر ابن العوام کہتے ہیں کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنے ہمراہ لے کر جنگل کی طرف چلے جب بہت دور نکل گئے تو ایک میدان نظر آیا جس میں بہت اونچے اونچے لوگ تھے جن کا قد بھالے بھالے برابر تھا۔ جب میں نے اُن کو دیکھا تو مارے خوف کے لرزنے لگا یہاں تک کہ میرے پاؤں میرے جسم کو تھام نہیں سکتے تھے۔ حضرت نے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے ایک لکیر کھینچکر مجھے فرمایا کہ اس کے اندر بیٹھ جاؤ۔ جب میں اُس میں بیٹھ گیا تو وہ خوف میرے دل سے جاتا رہا۔ پھر حضرت اُن کو تعلیم و تلقین فرما کر تشریف لائے۔
اس قسم کے واقعات متعدد ہوئے ہیں۔ سب میں یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن صحابیوں کو ہمراہ لے جاتے ان کو لکیر کے حصار میں بٹھاتے۔
یہ لکیر دیکھنے کو لکیر تھی۔ مگر در اصل ایک مضبوط قلعہ تھا کہ تمام روئے زمین کے جن اُس کو توڑنا چاہتے تو نہ توڑ سکتے۔ حالانکہ جنوں کی قوت مشہور ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام

سے ایک جن نے کہا کہ اگر آپ فرماتے ہیں تو تخت بلقیس کو میں ابھی اُٹھا لاتا ہوں۔ حالانکہ وہ بہت بڑا اور بہت دور تھا۔ اتنی قوت پر اُس لکیر کو وہ توڑ نہ سکے۔ آکام المرجان میں ہے کہ ابن مسعود رضؓ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک بار ساتھ لے گئے۔ وہ کہتے ہیں جب حضرت مجھے لکیر کے اندر بٹھا کر تشریف لے گئے تو میں نے دیکھا کہ دور سے ایک سیاہ غبار اُٹھا جس سے مجھی خوف ہوا کہ قبیلۂ ہوازن نے مکر کر کے قتل کے ارادہ سے حضرت کو یہاں بلایا ہے۔ اور اب وہ آن پہنچے۔ اس خیال میں نکلنا چاہا تھا۔ کہ حضرت کا ارشاد یاد آگیا۔ جو تاکید سے فرمایا تھا کہ اس مقام سے علحدہ نہ ہونا میں وہیں بیٹھا رہا۔ جب حضرت تشریف لائے اور میں اپنا قصہ بیان کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس لکیر سے نکلتے تو تمہیں کوئی جن اُڑا لیجاتا۔ انتہیٰ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُس لکیر کے اندر جانا اُن کی قدرت سے باہر تھا۔ اسی وجہ سے عامل لوگ کچھ پڑھکر حصار کر دیتے ہیں۔ خواہ بذریعۂ خط یا بذریعۂ اشارہ۔ اور ہر چند جن عاملوں کے دشمن ہوتے ہیں مگر جب تک عامل حصار میں ہوتا ہے وہ کچھ نہیں کر سکتے۔

شیخ اکبر قدس سرہ نے فتوحات کے باب مقام معرفت محبت میں لکھا ہے کہ اشبیلیہ میں ایک عارفہ تھیں۔ جن کا نام فاطمہ بنت مثنی تھا۔ اُن کی حالت بیان کر کے لکھا ہے کہ ایک روز انہوں نے کہا کہ

میرے حبیب نے مجھے سورۂ فاتحہ دی ہے جو میری خدمت کرتی ہے
اُس نے مجھے خدا کی جانب سے دوسری طرف مشغول نہ کیا میں اس
تقریر سے انکا مقام سمجھ گیا ایک روز ہم بیٹھے تھے کہ ایک عورت آئی
اور مجھ سے کہا۔ اے بھائی میرا شوہر شہر شنزونہ میں ہے میں نے
سنا کہ اس نے وہاں نکاح کرلیا ہے۔ اب کیا کرنا چاہئیے۔ میں نے کہا
کیا تم چاہتی ہو کہ وہ تم سے ملے۔ کہا۔ ہاں۔ میں نے اس بیوی سے
کہا کہ اے اماں یہ عورت جو کہہ رہی ہے کیا تم نے نہیں سنا۔ کہا۔ اے
لڑکے۔ تم کیا چاہتے ہو میں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اسی وقت
اس کی حاجت روائی ہو اور اُس کا شوہر اُس کے پاس آجائے۔ کہا
بہت اچھا۔ میں اس کی طرف فاتحۂ کتاب کو بھیجکر کہتی ہوں کہ اس کے
شوہر کو ابھی لے آئے۔ اور سورۂ فاتحہ پڑھنا شروع کیا۔ اور میں بھی
اُن کے ساتھ پڑھنے لگا۔ اُن کے پڑھنے میں ایک صورت ہوائیہ
متجسد ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ سورۂ ختم ہوئی تو ایک صورت
ہوائی مکمل ہوگئی۔ اور اُس سے کہا کہ اے فاتحہ الکتاب شہر شنزونہ
کو جاکر اس کے شوہر کو لے آ۔ ہرگز اس کو نہ چھوڑنا اس کے بعد صرف
اتنا وقت گزرا کہ آدمی وہاں سے آجائے۔ اُس کا شوہر آکر اپنے اہل
سے ملا۔

غوث الثقلین رض کی سلطنت

دائرۃ المعارف میں معلم لبطرس بستانی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص حضرت عبد القادر جیلانی رض کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ "میری ایک لڑکی گھر کے چھت پر چڑھی تھی۔ وہاں سے وہ غائب ہو گئی" آپ نے فرمایا کہ آج رات کو تم محلہ کرخ کے ویرانہ میں جاؤ۔ اور پانچویں ٹیلہ کے پاس بیٹھو۔ اور زمین پر یہ کہتے ہوئے ایک دائرہ اپنے اطراف کھینچ لو کہ بسم اللہ علی نیۃ عبد القادر جب اندھیرا ہو جائے گا تو جن کی ٹکڑیاں مختلف صورتوں میں تم پر گذرینگی اُن کی ہیبت ناک صورتوں کو دیکھکر ڈرنا نہیں صبح کے قریب ان کا بادشاہ ایک بڑے لشکر میں آئے گا۔ اور تم سے پوچھے گا کہ تمہاری کیا حاجت ہی تو کہدینا کہ مجھے عبد القادر رح نے بھیجا ہے۔ اور اُس وقت لڑکی کا واقعہ بھی بیان کر دو۔ اُس شخص نے اُس مقام پر جا کر تعمیل حکم کی اور کل واقعات وقوع میں آئے۔ جب بادشاہ نے اُس سے پوچھا۔ اس نے کہا کہ مجھے شیخ عبد القادر جیلانی رض نے بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ گھوڑے سے اتر پڑا۔ اور زمین بوسی کر کے دائرہ کے باہر بیٹھ گیا۔ اور اُس کی حاجت دریافت کی۔ جب اُس نے اپنی لڑکی کا واقعہ بیان کیا تو اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ جس نے یہ کام کیا ہے فوراً اُسے پکڑ لاؤ۔ چنانچہ ایک سرکش جن لایا گیا۔ جس کے ساتھ میری لڑکی بھی تھی۔ حکم دیا کہ اُس کی گردن ماردی جائے اور لڑکی کو میرے حوالہ کر کے رخصت ہو گیا۔ انتہیٰ۔

اس سے جنون کے علم کا بھی حال معلوم ہوتا ہے کہ دائرہ تو کرخ میں کھینچا گیا۔ اور مسافت بعیدہ پر پادشاہ کو خبر ہوگئی۔ کیونکہ رات بھر چلکر قریب صبح اس دائرہ کے پاس پہونچا جو صرف حضرت شیخ کی نیت پر کھینچا گیا تھا۔ اور اس سے حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کے تصرف کا حال بھی معلوم ہوگیا کہ جنون میں آپ کا کیا اثر تھا۔ کہ صرف لکیر جو آپکی نیت پر کھینچی گئی تھی وہاں پادشاہ بذات خود حاضر ہوا اور زمین بوسی کی۔ غرض کہ لکیر کی تاثیر خاص طور پر ہوتی ہے۔ اور اسی قسم کے تاثیرات اور بھی ہیں۔ چنانچہ اکام المرجان میں لکھا ہے کہ۔ جریر بن عبد اللہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ جب تستر فتح ہوا تو میں نے کسی موقع میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہا کسی ہربذ (خادم آتشکدہ مغان) نے سنکر کہا کہ جب سے میں نے یہ کلام آسمان پر سنا تھا اس کے بعد ابتک کسی سے نہیں سنا۔ میں نے کہا یہ کیا بات ہے کہا میں اکثر کسریٰ و قیصر کے پاس بطور وفد جایا کرتا تھا۔ ایک بار کسریٰ کے پاس گیا تھا جب واپس گھر آیا تو اپنی بیوی کو دیکھا کہ جس طرح میرے آنے پر ہمیشہ وہ خوش ہوتی تھی جیسے کہ عورتوں کی عادت ہے کہ مرد کے سفر کے آنے سے خوش ہوا کرتی ہیں اس بار خوش نہیں ہوئی۔ میں نے سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا تم تو سفر کو

گئے ہی نہیں۔ روز گھر میں آتے جاتے تھے۔ اس کے بعد وہ شخص ظاہر ہوا اور کہا میں تیری صورت میں اس عورت کے پاس آیا کرتا تھا اگر چاہتا ہے تو اب باری مقرر کر دیجائے ایک روز تو اس کے پاس رہے اور ایک روز میں میں نے قبول کیا ایک روز وہ میرے پاس آیا۔ اور کمال اخلاص سے کہا کہ ہم لوگ نوبت بنوبت آسمان کی طرف اس غرض سے جاتے ہیں کہ وہاں کی خبریں چرا لائیں۔ آج میری نوبت ہے اگر خواہش ہے تو تو میرے ساتھ چل میں نے کہا اچھا۔ جب رات ہوئی تو وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ مجھپر سوار ہو جا میں اس کی پیٹھ پر سوار ہوا دیکھا کہ خنزیر کے سے اس کی گردن پر بال ہیں اس نے کہا خبردار اچھی طرح بیٹھنا۔ اقسام کے خوفناک امور نظر آئیں گے اگر مجھ سے جدا ہو گیا تو سمجھ لینا کہ ہلاکت ہے یہ کہکر وہ اوپر کی جانب چلا یہانتک کہ آسمان کے قریب پہنچا اور وہاں میں نے سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ ما شاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن یہ سنتے ہی جتنے جن وہاں تک پہونچے تھے ان کی عجب حالت ہوئی کوئی کہیں گرا کوئی کہیں غرض وہ کلمات میں نے یاد رکھ لئے۔ جب صبح ہوئی میں اپنے گھر آیا۔ اس کے بعد جب وہ آتا میں وہ کلمات کہتا اور وہ بے قرار ہو کر بھاگ جاتا۔ چنانچہ چند روز

کے بعد اُس نے آنا موقوف کر دیا انتہیٰ۔ یہ تاثیر صرف الفاظ کی ہے غرض کہ جس طرح ہمارے اجسام میں سموم وغیرہ کی تاثیرات ہوتے ہیں جنوں کے اجسام میں لطیف چیزوں کی تاثیرات ہوتے ہیں۔ حضرت غوث الثقلین رضؓ کی سلطنت معنوی کا جو حال لکھا گیا اسی مناسبت سے ایک واقعہ لکھا جاتا ہے جو خالی از دلچسپی نہیں وہ یہ ہے۔

میرے ایک دوست ہیں جن کو میں چالیس سال سے جانتا ہوں کہ نہایت متقی محتاط اور با خدا شخص ہیں۔ جن کے تقدس پر صدہا شخص گواہی دیتے ہیں اور اُن کے فرزند جن کی نشو ونما صلاح و تقویٰ میں ہوی۔ ان دونوں سے خود میں نے سنا ہے اور میں یقیناً کہتا ہوں کہ اُن کی صدق بیانی میں مجھے ذرا بھی شک نہیں۔ اُن کا نام کسی مصلحت سے میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ اُن دونوں صاحبوں کا بیان ہے کہ صاحب مرقوم الصدر نے اپنے چھوٹے لڑکے کی شادی کی۔ اُس کے ساتھ ہی دولہا بیمار رہوا۔ چونکہ صاحب موصوف خود بھی عامل ہیں۔ انہوں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جن مسلط ہو گیا ہے بہت کچھ تعویذ فلیتے کئے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر لوگوں کی نشاندھی پر حضرت میراں داتار قدس سرہ کی خدمت میں مع بیمار حاضر ہوئے جن کا مزار اناوہ شریف اسٹیشن اونجا علاقہ

علاقہ گجرات میں واقع ہے۔ جب وقت مقررہ پر مزار شریف کے قریب بیمار بغرض علاج لایا گیا تو اس پر بیہوشی طاری ہوئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ کہنے لگا کہ تم نے مجھے بلا کر قید کر دیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس بیمار کے واسطے بلاتے ہو تو میں کبھی نہ آتا۔ بیمار کی حالت اور دیکھنے کی ہئیت گواہی دیتی تھی کہ وہ صاحب قبر کو دیکھتا ہے۔ اور خاص اُن سے سوال و جواب کر رہا ہے۔ اثنائے گفتگو میں کچھ پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتا تھا جیسے کوئی عامل مخاطب پر اثر ڈالنے کے لئے پھونکتا ہے۔ بیمار کی تقریر سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ حضرت نے ہماری طرف سے اُسے کچھ فرمایا جس کا وہ جواب دے رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ میں جو مسلط ہوا ہوں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے اُن سے کئی بار مختلف طریقوں سے کہہ دیا تھا کہ اس لڑکی کو مت کرو۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر میں نے اس کی اطلاع میر محمود صاحب کو دی جن کا مزار حیدرآباد میں پہاڑی پر ہے۔ جس خاندان کی یہ لڑکی ہے وہ لوگ میرا حق ادا کرتے تھے۔ یعنی تر سو کے نام کچھ نکالتے تھے۔ حضرت نے فرمایا یہ لوگ مسلمان ہیں ان سے کوئی توقع مت رکھ یہ تجھے کچھ نہ دیں گے۔ کہا اگر نہ دیں تو لڑکی میرے حوالے کر دیں حضرت کی جانب سے کسی قسم کی تہدید ہوئی تو اُس نے کہا تم میرا کچھ نہیں کر سکتے۔ جیسے تم ایک عہدہ دار ہو میں بھی عہدہ دار ہوں۔ اور میرا ماموں

محکمۂ صفائی کا افسر اور صاحب فوج و لشکر ہے چنانچہ اس کا ماموں آیا اور یہ بات قرار پائی کہ آج مقدمہ ملتوی کر دیا جائے۔ کل ایک کمیٹی ہو۔ جس کے چھے اراکین ہوں۔ جن میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ میر مجلس۔

اراکین

(۱) حضرت بابا شرف الدین صاحب برہاوی۔

(۲) حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی۔

(۳) حضرت ابو سعید بغدادی۔

(۴) حضرت بابا شرف الدین صاحب بھی شریک ہوں۔ جن کا مزار حیدر آباد میں پہاڑی پر ہے۔ چنانچہ مجلس برخواست ہوی۔ اور بیمار کو ہوش آگیا۔ دوسرے روز وقت پر جب بیمار مزار شریف کے پاس لایا گیا تو تھوڑی دیر میں بیہوش ہوگیا۔ اور اراکین کی آمد شروع ہوی۔ ہر ایک کو وہ مثل ہنود کے۔ اس صفائی سے ڈنڈوت کرتا جیسے مہذب ہنود کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ لڑکا عمر بھر ڈنڈوت نہیں کیا۔ اس کے بعد گفت و گو شروع ہوی۔ اس لب و لہجہ سے وہ گفت و گو کرنے لگا جیسے کوئی اعلیٰ درجہ کا بیرسٹر کرتا ہے۔ اور عبارت ایسی شستہ تھی جیسی ناولوں کی ہوتی ہے جس کے سننے کو جی چاہتا تھا۔ اثنائے گفتگو

میں مُڑ کر حکم دیتا تھا کہ فلاں فوج کو آراستہ کر کے لاؤ۔ اور فلاں فوج کو یہ حکم دو۔ منجملہ اور دلائل کے ایک دلیل اُس نے یہ پیش کی کہ میں نے ان کو کئی بار مختلف قرائن سے کبھی خواب میں کبھی دوسرے طریقوں سے منع کیا اور اُنھوں نے نہ مانا تو میں نے میر محمود صاحب کو باضابطہ اُس کی اطلاع دیدی۔ اگر شبہ ہو تو اس کی مثل اُن سے طلب کر لی جائے۔ چنانچہ ایک سوار مثل لانے کو روانہ ہوا۔ اور ہمیار خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مثل آئی اور پھر گفتگو شروع ہوی۔ اور ایسے دلائل اس نے قائم کئے کہ جن کا جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد ہرچند اہل کمیٹی نے اس پر زور دیا کہ آئندہ کوئی کسی قسم تعارض ہمیار سے نہ کرے۔ مگر اُس نے نہ مانا اور کہا کہ میں اس کمیٹی کے حکم سے راضی نہیں۔ شہنشاہ کے پاس اس مقدمہ کی مثل روانہ کر دی جائے۔ چنانچہ بغداد شریف کو مثل روانہ کر دی گئی۔ اور مجلس برخاست ہوئی۔ تیسرے روز جب اجلاس ہوا تو حضرت غوث الثقلین رضی کا فرمان صادر ہوا۔ اُس میں یہ حکم تھا کہ تو کیا سمجھتا ہے اگر میں چاہوں تو تجھے جلا کر خاک سیاہ کر دوں۔ مگر تو نے جب اُن کو اطلاع کر دی تھی تو معاف کیا گیا۔ مگر ہمارے لوگوں کی شان میں تو نے جو بے ادبی کی ہے اُس کی پاداش میں یہ سزا دی جاتی ہے کہ پابزنجیر کر کے اجمیر کے فلاں پہاڑ میں پانچ سال بامشقت محبوس رکھا جائے گا۔ اور روشن علی صاحب دارونہ مجلس

کو حکم دیا گیا کہ دو دفعہ مشقت لی جائے اور طرف ثانی پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ اس کے بعد بیڑیاں اور ہت کڑیاں لائی گئیں اور بیمار کے دونوں ہاتھ مل گئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہت کڑیاں ڈال دی گئیں اور اس کے بعد بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ اور ساتھ ہی بیمار کو ہوش آگیا اور اس وقت سے ابتک جس کو ایک سال سے زیادہ عرصہ گزرا ہے پر کسی قسم کا اثر نہیں دیکھنے ہتکڑیاں بیڑیاں پہننا ایک قسم کا مشاہدہ ہو گیا اور اس کے آثار بھی مرتب ہوئے کہ بیمار کو صحت ہو گئی۔ اب وہ بیڑیاں وغیرہ معلوم نہیں کہ لوہے کی تھیں یا اور کسی چیز کی مگر اتنا تو ضرور ثابت ہوا کہ وہ ایسی مضبوط تھیں کہ جن اُن کو نہ توڑ سکیں ہر چند یہ واقعہ عقل کے طریقہ سے قابل تصدیق نہیں۔ مگر کئی صاحبوں نے مجھ سے کہا کہ حضرت میراں داتار رح کی قبر پر ہمیشہ آسیب زدہ آتے ہیں اور صحت پا کر جاتے ہیں۔ روزانہ اس قسم کے صدہا واقعات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے قطع نظر اس کے میں نے دیکھا کہ آج کل دنیائے فلسفۂ جدیدہ میں ایک ہل چل مچی ہوی ہے اور لاکھوں فلاسفر ایسے امور کے قائل ہوتے جاتے ہیں جس کو عقل ہرگز قبول نہیں کرتی۔ جیسے ہوشیار آدمی کے جسم میں سے کل اعضاء آدھے آدھے جُدا ہو جانا وغیرہ۔ چنانچہ فاضل فرید وجدی نے لکھا ہے یورپ و امریکہ میں ماہانہ بیس رسالے ان مسائل سے متعلق نکلتے ہیں۔ جو ایسے واقعات عجیبہ وغریبہ سے بھرے

ہوتے ہیں

بھرے ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس کے بیان پر جرأت کی۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کو اس وقت بھی وہی سلطنت حاصل ہے جو زندگی میں تھی۔ جنون کو چونکہ بوجہ لطافت روحانیت سے مناسبت ہے اس لئے وہ اس عالم کے حالات کو مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور انسان نہیں کر سکتے۔ مگر حضرت انسان کو بھی ایک ایسی قوت دی گئی ہے کہ اگر اس میں کمال حاصل کریں تو علاوہ اس عالم کے مشاہدہ کے ایسے ایسے کرشمے بتائیں کہ جن بھی حیران ہو جائیں۔ وہ قوت یہی خیال ہے۔ جب وہ پختہ کیا جاتا ہے تو خیال منفصل کا جو عالم ہے اس میں تصرفات کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ اپنی صورت کو خیال منفصل میں قائم کر دیتا ہے۔ قضیب البان رح وغیرہ کو یہی بات حاصل تھی۔ اس کا حال حضرت شیخ محی الدین عربی رح نے فتوحات مکیہ میں خوب تفصیل سے لکھا ہے اولیاء اللہ اس وجہ سے کہ خدائے تعالےٰ کے وہ محبوب ہیں ان کو جو قدرت دی جاتی ہے اس کا تو بیان نہیں ہو سکتا۔ مگر ظاہرا اس عالم میں ان کو تصرف اس غرض سے دیا جاتا ہے کہ ان کی کرامت ظاہر ہو۔

بات یہ ہے کہ جب مسلمان شخص خدا و رسول کی مرضی کے مطابق کام کرتا ہے تو وہ خدائے تعالےٰ کے نزدیک مکرم یعنی صاحب کرامت ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم یعنی

خدائے تعالٰے کے نزدیک تم میں کا وہی شخص زیادہ کرامت والا ہے
جو زیادہ تر متقی ہو۔ جب تقویٰ کی وجہ سے کوئی شخص خدائے تعالیٰ کے
نزدیک باکرامت ہو جائے تو بسبب مقتضائے وقت و صلاحیت اسکو
تصرف کی اجازت دی جاتی ہے۔ جس میں لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ
یہ صاحب کرامت ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہو گی کہ کرامت اُس
فعل کا نام نہیں ہے جو ولی سے بطور خرق عادات صادر ہوتا ہے بلکہ وہ
فعل قرینہ اس امر پر ہے کہ وہ شخص عند اللہ مکرم و باکرامت ہے جو فعل
بالذات کرامت پر دال ہے وہ تقویٰ ہے۔ اگر خدائے تعالٰے نے کسی کو
صفت تقویٰ عنایت کی ہے تو یقیناً سمجھا جائے گا کہ وہ عند اللہ مکرم
یعنی باکرامت ہے اور دوسرے افعال و خوارق عادات بالواسطہ اور بالتبع
کرامت سمجھے جائینگے۔ یعنی تقویٰ کی وجہ سے وہ تصرفات ہوں گے

شیخ الاسلام سبکی رح نے طبقات شافعیہ میں لکھا ہے کہ ابو علی رودباری
کہتے ہیں کہ ابو العباس رقّی سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ ایک بار میں
ابو تراب نخشبی رح کا ہم سفر تھا۔ مکہ معظمہ کے راستہ میں مجھپر تشنگی غالب ہوئی
شیخ سے عرض کی اُنہوں نے زمین پر پاؤں مارا جس سے نہایت سرد
شیریں پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ میں نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ ایسا
لطیف پانی عمدہ پیالہ میں پیوں۔ آپنے زمین پر ہاتھ مارا نہایت شفاف

بلورین پیالہ برآمد ہوا - چنانچہ مکہ معظمہ تک وہ پیالہ ہمارے ساتھ رہا ایک روز انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارے اصحاب ایسے امور میں کیا کہتے ہیں - میں نے کہا - میں نے تو کسی کو کرامتوں کا انکار کرتے نہیں دیکھا - فرمایا یہ تو سچ ہے کہ کرامت کا منکر کافر ہے - مگر میں نے جو تم سے پوچھا مقصود اس سے یہ تھا کہ جس کا یہ حال ہو اوسکی نسبت کیا کہتے ہیں - میں نے کہا میرے خیال میں اس وقت اُن کا کوئی قول نہیں فرمایا تمہارے اصحاب کا یہ قول ہے کہ جس کو یہ تصرف دیا جاتا ہے وہ خدائے تعالےٰ کی جانب سے اُس کے حق میں خداع ہے - مگر یہ قول عموماً درست نہیں - البتہ خداع اُس کے حق میں ہے جس کا مقصود اصلی صرف خوارق عادات کا اظہار ہو - اور جس کا یہ خیال نہ ہو تو وہ ربانیین میں ہے - امام سبکی رح نے اُس کے بعد مسئلہ کرامت میں نہایت بسوط بحث کی ہے اُس میں سے بحسب ضرورت یہاں لکھا جاتا ہے - لکھا ہے کہ بعض علماء نے کرامت کا بالکل ہی انکار کردیا اور بعض کہتے ہیں کہ کرامت حد خرق عادت تک نہیں پہنچ سکتی - ورنہ معجزہ کی مشابہ ہو جائے گی - اور نبی اور ولی میں اشتباہ ہو جائے گا - قدریہ کرامت کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں - اُن کے شبہات یہ ہیں - کہ اگر کرامت جائز رکھی جائے تو سفسطہ کی نوبت پہنچ جائے گی - اور یہ کہنا

پڑیگا کہ ممکن ہے کہ پہاڑ سونا ہو اور سمندر خون ہو جائے - اور گھر کے برتن بڑے بڑے فاضل امام ہو جائیں - اور نیز وہ معجزہ کے مشابہ ہو گی جس سے معجزہ کی دلالت جو نبوت پر ہوتی ہے فوت ہو جائے گی -

اور نیز اگر ولی سے خوارق عادات صادر ہوتے ہوں اور کوئی نبی اس وقت مبعوث ہو تو چونکہ ولی کے حق میں خوارق عادات عادی امور ہو گئے ہیں - اس لئے اُس کے نزدیک نبی کی نبوت کو تصدیق کرنے کے لئے کوئی دلیل نہ ہو گی - اور ایک شبہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص صالح کے لئے کرامت جائز ہو تو ممکن ہے کہ صلح بہت سے ہوں اور جب پےبہ پے خوارق عادات ظاہر کریں تو وہ عادت ہو گئی - اُس کے بعد خوارق عادات نبوت پر دلیل نہیں ہو سکتے -

اور اُن کا یہ بھی استدلال ہے کہ اگر کرامت کسی کو دی جائے تو صحابہ زیادہ تر اُس کے مستحق تھے - حالانکہ اُن کے ہاتھ پر کبھی کرامت ظاہر نہ ہوئی یہ قدریہ کے شبہات ہیں - اس کے جوابات امام موصوف نے نہایت تفصیل سے دئے ہیں - جس کا ذکر موجب تطویل ہے - اگر غور کیا جائے تو ان شبہات میں اکثر کا مدار امکان پر ہے - مگر یہ دیکھا جائے کہ ایسا امکان بھی مضر ہو سکتا ہے یا نہیں - ہر ایماندار اس کی تصدیق کرتا ہے کہ خدائے تعالےٰ نے ازل ہی میں فیصلہ فرما دیا کہ عالم میں کس قسم کی

کتنی

کتنی چیزیں پیدا کی جائیں گی۔ اور اُن کے تفصیلی حالات کیا ہوں گے
اور ہر ہر آن میں جو عوارض ہر چیز پر آنے والے ہیں سب متعین ہو گئے
جس زمانے میں جس چیز پر جو حالت ہوتی ہے وہ ازل میں حق تعالےٰ
کے پیش نظر ہو چکی۔ اور ابد تک ایک حالت پر عام ہے۔ ارشاد ہے
ما یبدل القول لدیّ اگر زید کو مثلاً ازل میں عالم کیا ہے تو کوئی
اُس کو جاہل بنا نہیں سکتا۔ اور اگر جاہل کیا ہے تو کوئی اُس کو عالم بنا نہیں
سکتا۔ تقدیر کے مسئلہ کو تو ہم نے بفضلہ تعالیٰ مقاصد الاسلام کے کسی
حصّہ میں حکمت جدیدہ کے طریقہ سے بھی ثابت کیا ہے۔ غرضکہ جب
ازل سے ابد تک موجود ہونے والی ہر چیز خدائے تعالےٰ کے علم میں
اس طور پر ممتاز و مشخص ہے کہ ہر آن میں وہ کن اوصاف سے متصف ہو گی
تو یہ احتمال ہی نہ رہا کہ اُن معلومات الٰہیہ کے سوا کوئی چیز وجود میں
آئے گی یا اُن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو گا۔ اس صورت میں جو چیز
وجود میں آتی ہے وہ ضرور واجب الوجود ہو گی۔ لیکن وجوب ذاتی نہ ہو گا
بلکہ لغیرہٖ ہو گا۔ اب اگر اُس کو ممکن کہیں تو صرف اُس کے مرتبۂ ذات کا امکان
مراد ہو گا۔ پھر قبل وجود بھی اگر دیکھا جائے تو چونکہ علم الٰہی میں اُس کے تمام
حالات و کیفیات متعین ہو چکے ہیں کہ فلاں چیز جب وجود میں آئیگی تو
وہ اس طور پر ہو گی تو وہاں بھی ایک جانب کی ترجیح ہو گی اور ممکن کے

جو دو جانب ہوتے ہیں اُس میں دوسری جانب مرجوح ہو گئی جس کی ترجیح محال ہے تو اس صورت میں جانب مرجوح محال ہونا ثابت ہو جس کا مطلب یہ ہوا کہ عالم میں دو ہی چیزیں ہیں۔ واجب یا ممتنع، ممکن کوئی چیز نہیں۔

اب جو کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ کرامت سے ظروف فاضل بن جائیں اور یہ ہؤا اور وہ ہو تو صرف احتمال ہی احتمال ہے۔ ممکن کوئی چیز نہیں۔ خدائے تعالےٰ نے جس ولی کے ہاتھ سے جو کام ہونا ازل میں معین فرمادیا ہے۔ اس کا وجود واجب ہے اور جو اُس کے خلاف ہے اُس کا وجود ممتنع۔ ولی کا ارادہ ایسی چیز سے متعلق ہو ہی نہیں سکتا جو خلاف مشیت الٰہی ہو۔

حدیث صحیح میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللھم

ان قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدك لم تملكنا منها شیئاً

یعنی یا اللہ ہمارے دل اور پیشانی کے بال اور کل جوارح تیرے ہاتھ میں ہیں۔ تونے ان میں سے کسی چیز کا ہمیں مالک نہیں بنایا۔ اس صورت میں امکانی احتمالات سب باطل ہو گئے۔ اور اگر پہاڑ کا سونا کسی کی کرامت سے ہونا علم الٰہی میں ہے تو وہ ضرور ہو گا۔ کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ پہاڑ کو سونا نہیں بنا سکتا؟ ہرگز نہیں۔ پھر

کرامت سے پہاڑ سونا بن جائے تو کیا تعجب ہے۔ اگر اسی کا نام سفسطہ ہے تو روزانہ لاکھوں سفسطے وجود میں آتے ہیں۔ دیکھئے نباتات کا انسان اور اما م و فاضل بننا روزانہ برابر دیکھا جاتا ہے۔ جس کا حال ہم نے کتاب العقل میں بتفصیل لکھا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ نبی اور ولی میں فرق نہ رہے گا تو اس کا منشا یہ ہے کہ معترض نے ولی کو فاسق سمجھا ہے کہ وہ کرامتیں دکھا دکھا کر لوگوں کو نبی کی طرف سے اشتباہ میں ڈالدیگا۔ تاکہ نبی کی نبوت ثابت نہ ہونے پائے اگر ایسا ولی فرض کیا جائے تو وہ واقع میں ولی نہیں ہوسکتا۔ اس کے حسب حال یہ شعر ہے۔

کارِ شیطاں می کند نامش ولی
گر ولی اینست لعنت بر ولی

اور اگر ولی ایسا شخص جو سر مو خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ کرے تو وہ اگر نبی کے ساتھ رہکر بھی کرامتیں ظاہر کرے تو اُس سے نبی کی نبوت کی تائید ہوگی کیونکہ وہ لوگوں سے صاف کہا کریگا کہ میں اُن کا ایک ادنیٰ غلام ہوں جو انہی کی اتباع کی بدولت مجھے یہ مرتبہ حاصل ہوا اس سے تو بجائے اس کے کہ نبوت میں اشتباہ واقع ہو۔ لوگوں کو ایمان لانے پر ترغیب ہوگی۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ معجزہ اور کرامت میں فرق

نہ ہوگا یہ درست ہے۔ کیونکہ خرق عادت خواہ نبی سے صادر ہو یا ولی سے
بغیر اجازت الٰہی ممکن نہیں۔ مگر جس کے ہاتھ پر خرق عادت ظاہر ہوئی
وہ نبی تھے تو کہدیتے تھے کہ ہم نبی ہیں۔ اور اس پر ہمیں یہ نشانی دی
گئی ہے اگر تمہیں شک ہو تو مقابل ہو کر یہی کام کر دکھاؤ۔ اس دعوے اور
دلیل کے بعد اہل انصاف اُن کی نبوت کو تسلیم کرتے گئے اور اگر وہ
یعنی صاحب خرق عادت ولی ہوں تو کبھی اس قسم کا دعوے نہیں کر سکتے
اگر بفرض محال دعویٰ کیا تو ولایت تو درکنار مسلمانوں میں بھی اُن کا ٹھکانا
نہیں۔ کیونکہ نبوت کا جھوٹا دعوے کرنے والا یقیناً کافر ہے۔ اور
کافروں میں بھی اعلیٰ درجہ کا۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ اگر بادشاہ کسی کو اپنی
طرف سے کسی ملک کا حاکم بنا دے اور اس کے ساتھ ایسی نشانی مثل
پروانہ دے جو دوسرا وہ نشانی نہیں لا سکتا تو وہ حاکم بادشاہ کا مورد
عنایت سمجھا جائے گا۔ بخلاف اس کے ایک شخص اسی قسم کی نشانی
کسی ملک میں لیجا کر یہ دعوے کرے کہ بادشاہ نے مجھے حاکم بنا دیا ہے
اور ایک جعلی نشانی بھی پیش کر دے تو کیا ایسا شخص مورد عنایت شاہی
ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس جرم کے معاوضہ میں ایسی سخت سزا
تجویز کی جائے گی جو معمولی جرائم کی سزا سے بدرجہا زائد ہو۔
اب غور کیجئے کہ نبوت سے بڑھکر خدائے تعالےٰ کے یہاں کوئی مرتبہ

اور

اور عہدہ نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے نام آوری یا متاع دنیوی حاصل کرنیکی
غرض سے دعوے نبوت کرے اور اُس پر جعلی نشانیاں بھی پیش کرے تو
کیا ایسا شخص خدائے تعالے کے نزدیک معمولی کافروں میں ہوگا؟ میری دانست
میں تو وہ فرعون وشداد سے بھی بدتر ہوگا۔ کیونکہ اُن کو خدائے تعالیٰ نے
بادشاہت دی تھی۔ اس لئے اُنہوں نے اپنی وجاہت ظاہری قائم
رکھنے کی غرض سے نبیوں کا مقابلہ کیا۔ بخلاف مدعیان نبوت کے کہ
وجاہت پیدا کرنے اور دنیا حاصل کرنے کی غرض سے اُنہوں نے جھوٹ کہی اور جھوٹ
بھی کیسی کہ خدائے تعالیٰ پر تہمت لگائی۔ کہ اُس نے ہمیں بھیجا ہے۔ اور
اس جھوٹ کو بادقعت بنانے کی غرض سے جعلی نشانیاں بنائیں۔ لوگونکو
فریب دیکر اُن کا مال کھایا۔ پہلے سے جس نبی کی سلطنت قائم تھی بغاوت کرکے
اُس کو درہم وبرہم کردیا۔ نبی اور اولیاء اللہ کو ایذائیں پہنچائیں۔ حق تعالیٰ
فرماتا ہے ان الذین یؤذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی
الدنیا والآخرۃ واعد لھم عذابا مھینا یعنی جو لوگ خدا ورسول
کو ایذا دیتے ہیں اُن پر دنیا وآخرت میں اللہ کی لعنت ہے اور اُن کے
لئے خدائے تعالےٰ نے عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اس کے سوا مدعیان
نبوت کو کیسی کیسی کارسازیاں اور جرائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے
ہم نے مفاتیح الاعلام میں مرزا صاحب قادیانی کی تھوڑے حالات لکھے ہیں

اُس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مدعیان نبوت کو کیسی کیسی مصیبتوں میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ جو کہا گیا کہ اولیا سے خوارق صادر ہوں تو وہ بوجہ عادت معجزہ کو معجزہ نہ سمجھیں گے۔ اس موقع میں بھی "ولی" ایک معمولی شخص خیال کر لیا گیا کہ وہ کرامتوں میں ایسا مشغول ہو جاتا ہے کہ نہ اُسے خدا سے کام نہ رسول سے کیا ایسا شخص ممکن ہے کہ ولی ہو سکے؟ اور اُس کی کرامتیں بحال رہیں؟ ہرگز نہیں۔ ولی تو وہ شخص ہوتا ہے کہ ہر آن میں اس کی توجہ خدائے تعالےٰ کی طرف رہتی ہے بذریعۂ الہام یا کشف یا رویائے صالحہ سے انہیں اطلاع ہو جاتی تھی کہ "فلاں نبی ہیں اُن کا اتباع کرو" پھر خوارق عادات کا امور عادیہ ہو جانا جو خیال کیا گیا ہے وہ بھی بے اصل محض ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی قائل نہیں کہ جو کام اولیاء اللہ کرتے ہیں سب خوارق عادات ہوتے ہیں۔ اس لئے خوارق کی اُن کو عادت ہو جاتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ معاملہ بالعکس ہے۔ اس لئے کہ ہر کام میں اولیاء اللہ کی نظر اس پر رہتی ہے کہ معمولی کام جن کو ہر شخص اپنے اختیاری سمجھتا ہے وہ بھی ہم سے وجود میں آتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر تو پورا ایمان ہے کہ اَللّٰھُمَّ

ان قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدك لم تملکنا منها شیئا

اگر کوئی اچھا کام اُن سے صادر ہو گیا تو خدائے تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہیں

کرامتیں

کہ الٰہی اس کام کو صرف اپنے فضل و کرم سے تو نے انجام دیا ورنہ ممکن نہ تھا کہ ہم اپنی ذاتی قوت سے اُس کو پورا کر سکتے جیسا کہ صاف ارشاد ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ اب کہئیے جو لوگ معمولی کام کو بمنزلہ خرق عادت سمجھتے ہوں تو خرق عادت کو اُن کے نزدیک کیسی وقعت ہو گی۔

غرض کہ یہ ممکن نہیں کہ نبی کا معجزہ اُن کی نظروں میں بے وقعت ہو سکے۔

اس تقریر کے بعد اہل انصاف غور فرما سکتے ہیں کہ جو دلائل عدم جواز خرقِ عادت پر قائم کئے گئے ہیں ہیں وہ کس درجہ کی ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ صحابہ سے کرامت کا صدور نہ ہوا سو وہ غلط ہے علامہ سبکی رہ نے صحابہ کی کرامات کی ایک فہرست ہی لکھی ہے۔ جس کو ہم بالاختصار نقل کرتے ہیں۔

صدیق اکبر رہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ بیس وسق کھجور اس سال کے بار سے لے لینا۔ چند روز کے بعد فرمایا اگر کھجوریں لے لی ہوں تو خیر ورنہ اب اُس مال سے وارثوں کا تعلق ہو گیا۔ اور صرف تمہارے دو بھائی ہیں اور دو بہنیں۔ انہوں نے کہا کہ میری بہن تو اسما ایک ہی ہے فرمایا دوسری حمل میں ہیں۔ چنانچہ وہ تولد ہوئیں۔ دیکھئے حق تعالے

فرماتا ہے۔ ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام (الآیہ) اس آیۂ شریفہ میں پانچ چیزوں کا ذکر ہے جن کو خدائے تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ حمل لڑکے کا ہے یا لڑکی کا۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلا تکلف خبر دے دی کہ حمل میں لڑکی ہے۔ اور وہ خبر صحیح بھی نکلی۔ یہی کرامت ہی کہ خدائے تعالیٰ نے اُن کو وہ علم دیا جو اُس کے ساتھ مختص تھا اور اپنے موت کی خبر دے دی کہ بہت قریب ہے یہاں تک کہ ورثہ کا حق مال سے متعلق کر دیا۔ ایسے موقع میں بعض لوگ ڈھٹائی سے کہدیتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات نص قرآن کے خلاف ہیں۔ اس لئے ایسے روایات کو موضوع سمجھنا چاہیئے۔ ایسی جرأت کا منشا عدم غور و تدبّر اور لاعلمی ہوا کرتا ہے۔ اُن سے پوچھا جائے کہ خدائے تعالیٰ نے یہ کب فرمایا کہ ان چیزوں کا علم میں کسی کو دیتا ہی نہیں۔ وہاں تو صرف اتنا ہے کہ ان امور کو خدائے تعالیٰ جانتا ہے۔ بے شک وہ جانتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا بھی اُن چیزوں کو جانے تو علم الٰہی میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔ کیونکہ دوسروں کا جاننا علم الٰہی کے منافی نہیں۔ پھر اگر کسی کو علم ہوتا بھی ہے تو وہ صرف عطائے الٰہی ہے جس میں اہلیت اور لیاقت دیکھتا ہے اُسے عطا فرماتا ہے۔ ارشاد ہے وما کان عطاء ربک محظورا

غرض کہ ایسی روایتوں کو موضوع قرار دینا کوئی علمی بات نہیں۔

ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے یہاں کھانا دو شخصوں کا ہو تو اہل صفہ میں سے ایک شخص کو اور جس کے یہاں چار شخصوں کا کھانا ہو تو پانچویں کو ساتھ لیجا کر کھانا کھلائیں۔ ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ تین شخصوں کو ساتھ لے گئے۔ جب وہ ایک ایک لقمہ اُٹھاتے تو اُتنا ہی کھانا نیچے سے بڑھتا۔ یہاں تک کہ جب فارغ ہوئے تو کھانا جتنا رکھا گیا تھا اس سے سہ چند زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ سب گھر والوں نے کھا کر حصے بانٹے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ملک فارس پر کچھ لشکر ساریہ بن زنیم کے ہمراہ بھیجا جب وہ شہر نہاوند کے دروازہ پر پہنچے اور اُس کا محاصرہ کرنا چاہا کفار کا لشکر کثیر آگیا اور سخت لڑائی ہوئی۔ یہانتک کہ قریب تھا کہ مسلمانوں کو ہزیمت ہو جائے۔ اُس وقت عمرؓ مدینۂ منورہ میں جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے۔ عین خطبہ میں بآواز بلند کہا (یا ساریۃ الجبل، یا ساریۃ الجبل من استرعی الذئب الغنم فقد ظلم) یعنی اے ساریہ پہاڑ۔ اے ساریہ پہاڑ۔ جو شخص بھیڑیے سے بکریاں چرانے کا کام لے اُس نے ظلم کیا۔ اس کلام کو کل لشکر اسلام نے سنا۔ اور کہنے لگے یہ تو امیر المومنین کی آواز ہے۔ غرض کہ فوراً پہاڑ کی پناہ میں چلے گئے اور اُس کے بعد اُن کی فتح ہو گئی۔ علی کرم اللہ وجہہ بھی عمرؓ کا خطبہ سن رہے تھے

لوگوں نے کہا کہ امیرالمومنین نے کیسی بات کہی۔ ہم کہاں اور ساریہ کہاں آپنے فرمایا عمر رضؓ کے معاملہ میں دخل نہ دو۔ وہ جس کام میں داخل ہوتے ہیں اوس کو پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب لشکر کے لوگ واپس آئے تو وہ واقعہ بیان کیا۔ کہ ہم لوگ امیرالمومنین کی آواز سنتے ہی فوراً پہاڑ کے پناہ میں آگئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ کلام عمر رضؓ کا بیکار نہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ سے لشکر اسلام صرف تلف ہونے ہی سے نہیں بچا بلکہ اُس کو فتح بھی نصیب ہوئی۔ دیکھئے اس وقت نہاوند اور اُس کے مضافات عمر رضؓ کے پیش نظر تھے اور کوئی حالت وہاں کی مخفی نہ تھی۔ جس طرح افسر اعلیٰ مواقع جنگ کو دیکھ بھکر فوج کو لڑاتے ہیں۔ عمر رضؓ نے بھی یہی کام کیا۔ اور نادر بات یہ کہ ہزارہا کوس پر آواز فوراً پہنچ گئی اگر صحابہ نفس کرامت کے قائل نہ ہوتے تو ضرور کہتے کہ آواز تو عمر رضؓ کی ہے۔ مگر یہ تو ممکن نہیں کہ اُن کو یہاں کے حالات پر اطلاع ہو۔ کیونکہ علم غیب خدائے تعالےٰ کا خاصہ ہے اور اس کے خلاف خیال کرنا شرک فی العلم ہے۔ پھر اپنی آواز کو ہزارہا کوس سے یہاں پہنچانا شرک فی التصرف ہے۔ اگر عمر رضؓ کا یہ کام سمجھا جائے تو ایمان جانے کی بات ہے۔ اس لئے اس میں شک نہیں کہ شیطان ہی نے ہمیں تباہ کرنے کے واسطے یہ کارسازی کی ہے اس وقت ہمیں چاہیئے کہ شیطان کے مکر و فریب سے بچنے کے لئے

پہاڑ سے بہت دور ہٹ جائیں اگر اس قسم کے موحدانہ خیال اُن کو آجاتے تو سب غارت ہو گئے تھے۔

زمانۂ جاہلیت میں جب نیل کے جاری ہونے کا وقت آتا تو باکرہ لڑکی کو لباس فاخرہ اور زیور سے آراستہ و پیراستہ کر کے نیل میں ڈال دیتے جب عمر رض کے وقت میں مصر فتح ہوا تو لوگوں نے عمرو بن عاص رض سے جو وہاں کے حاکم تھے حسب عادت لڑکی کو نیل میں ڈالنے کی درخواست کی انہوں نے کہا اسلام ایسے عادتوں کو ہدم کر دیتا ہے۔ تین مہینے تک نیل جاری نہ ہوا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے قحط کی وجہ سے جلا وطن ہونے کا قصد کر لیا۔ عمرو بن عاص رض نے عمر رض کو اس واقعہ کی اطلاع کی۔ آپ نے لکھا تم نے بہت اچھا کیا۔ کہ اجازت نہ دی۔ اسلام پہلی باتوں کو ہدم کر دیتا ہے۔ پھر آپ نے ایک چٹھی نیل کے نام لکھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اے نیل اگر تو اپنی طرف سے جاری ہوا کرتا ہے تو مت جاری ہو۔ اور اگر خدائے تعالیٰ قہار تجھے جاری کرتا ہے تو ہم اُس سے سوال کرتے ہیں کہ تجھے جاری کر دے۔ اور فرمایا کہ یہ چٹھی نیل میں ڈال دو۔ چنانچہ ڈال دی گئی لوگوں نے جب صبح کو دیکھا تو سولہ ہاتھ بلند پانی اُس میں جاری تھا۔

ایک شخص عثمان رض کے پاس آرہا تھا۔ راستہ میں ایک عورت پر اُس کی نظر پڑی خوب غور سے اُس کو دیکھا۔ جب حاضر خدمت ہوا

آپ نے فرمایا بعض لوگ ایسے بھی یہاں آتے ہیں جن کی آنکھوں میں زنا کا اثر رہتا ہے۔ اُس شخص نے کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی وحی اترا کرتی ہے۔ فرمایا نہیں۔ فراست سے ایسی باتیں معلوم ہوا کرتی ہیں۔ یہ آپ کا ارشاد اُس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ یعنی ایماندار اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ جب مومن کامل اللہ تعالےٰ کے نور سے دیکھتا ہو تو اُس سے کون چیز چھپ سکتی ہے۔ ہمارے نورِ نظر کا جب یہ حال ہے کہ آسمان تک پہنچتا ہے تو خدائے تعالےٰ کے نور کا کیا حال ہو۔ اب غور کیجئے کہ جس کی رؤیت کا ایسا ذریعہ ہو تو کیا بُعد و کثافت ایسے شخص کی رؤیت کے مانع ہو سکتی ہے۔

ایک رات علی کرم اللہ وجہہ اور دونوں صاحب زادے اپنے مکان میں تشریف رکھتے تھے کہ دو پہر رات کے بعد یہ اشعار آپ کو سنائی دئے۔

یا من یجیب دعاء المضطر فی الظلم

یا کاشف الضر و البلوی مع السقم

قد نام وفدک حول البیت وانتبھوا

وعین جودک یا قیوم لم تنم

ھل لی بجودک فضل العفو عن زللی

یا من الیہ رجاء الخلق فی الحرم
ان کان عفوک لا یرجوہ ذو خطاء
فمن یجود علی العاصین بالنعم

اپنے صاحبزادے سے فرمایا دیکھو یہ کون پڑھ رہا ہے۔ اور اُس کو بلا لاؤ۔ وہ تشریف لے گئے اور اُس سے فرمایا کہ امیر المومنین تمہیں بلاتے ہیں۔ وہ شخص اُٹھا اور اپنی ایک جانب کو کھینچتا ہوا آیا۔ آپ نے فرمایا میں نے اشعار سنے بیان کرو کہ واقعہ کیا ہے کہا کہ میری حالت یہ تھی کہ ہمیشہ لہو لعب اور معصیت میں مشغول رہتا تھا اور میرے والد مجھ کو وعظ و نصیحت کرتے کہ دیکھو خدائے تعالیٰ کی بڑی سطوت ہے اور وہ انتقام لینے والا ہے وہ ظالموں سے دور نہیں۔ جب وہ حد سے زیادہ نصیحت کرنے لگے تو مجھے غصہ آگیا اور میں نے اُنہیں مارا۔ اُنہوں نے ساتھ ہی قسم کھائی کہ میں مکہ معظمہ کو جاکر بارگاہ کبریائی میں اس باب میں فریاد کرونگا۔ چنانچہ وہ وہاں گئے اور دعا شروع کی ہنوز وہ دعا پوری نہیں ہوئی تھی کہ میرا ایک بازو سوکھ گیا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا سخت ندامت ہوئی۔ اور میں اُن کی خوشامد کرکے اُنہیں راضی کرلیا۔ چنانچہ اُنہوں نے اقرار کیا کہ اب میں تیری صحت کے لئے اُسی مقام میں دعا کروں گا جہاں بد دعا کی تھی چنانچہ میں نے اُن کے لئے

اونٹنی لادی - اور وہ سوار ہوئے قسمت سے وہ اونٹنی اُن کو لے کر بھاگی - اور وہ اُس پر سے گر کر مر گئے - آپ نے پوچھا کہ کیا فی الحقیقت وہ تجھ سے راضی ہو گئے تھے - کہا خدا کی قسم وہ راضی ہو گئے تھے -

آپ یہ سُن کر اُٹھے اور چند رکعت نماز پڑھکر آہستہ آہستہ بارگاہ کبریائی میں کچھ عرض کی - اُس کے بعد فرمایا - اے مبارک اُٹھ - چنانچہ وہ شخص اُٹھکر چلنے لگا - اور وہ شکایت بالکل دفع ہو گئی - پھر فرمایا اگر تم اپنے باپ کے راضی ہونے پر قسم نہ کھاتے تو میں دعا نہ کرتا - اس واقعہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دو کرامتیں ثابت ہیں - ایک یہ کہ حق تعالےٰ کے نزدیک آپ ایسے مکرم سمجھے کہ عرض کرنے کی دیر تھی کہ اُس کی پذیرائی ہو گئی - اور جو اعضا کہ مردہ ہو چکے تھے اُن میں جان آگئی - دوسری کرامت یہ کہ باوجودیکہ آپ کو عرب و عجم کی سلطنت حاصل تھی - مگر حالت یہ کہ ایوان شاہی میں ایک بھی خدمتگار نہ تھا - چنانچہ دوپہر رات کے بعد جب آپ کو اس شخص کے بلانے کی ضرورت ہوی تو اپنے صاحبزادے کو بھیجنا پڑا - اس ترک و تجرید سے بڑھکر اور کیا کرامت ہو سکتی ہے - ادنےٰ ادنےٰ حکام کے دروازوں پر خدم و حشم ہوتے ہیں اور خلیفۃ اللہ کی یہ حالت کہ نوکر تو درکنار - وقت پر کھانا پیٹ بھر کر ملنا دشوار تھا جس کا حال ہم نے مقاصد الاسلام کے

حصۂ ششم میں لکھا ہے۔ ظاہر بین لوگ اس حالت کو کرامت نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں تو جو کچھ وقعت ہے دنیا ہی کی ہے وہ فقر اختیاری کے مدارج کو کیا جانیں دولتِ فقرِ اختیاری ہر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ تو اُنہیں حضرات کے حصہ میں ہے جو خدائے تعالیٰ کے نزدیک اکرم ہیں قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم اگر کرامت کے معنی خرق عادت کے لئے جائیں تو وہ بھی فقر اختیاری میں صادق آتے ہیں۔ دیکھئے صرف اس خیال سے کہ ہر حالت میں خدائے تعالیٰ اضطراری طور پہ یاد آتے رہے۔ تمام اسباب راحت و عیشت کو ترک کر دینا کیا ہر کسی کا کام ہے۔ شاید لاکھوں میں کوئی ایک ہو جو خالصاً للہ ایسا فقر اختیار کرے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اسباب معیشت فراہم کرنے کی فکر میں ہم لوگ لگے رہتے ہیں۔ اور اگر کوئی فقیر ہو بھی گیا تو اُس میں بھی یہی مقصود ہوتا ہے کہ بذریعۂ فقر دنیا حاصل ہو۔ اور اگر اُس سے مال مقصود نہ بھی ہو تو جاہ مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی معتقد بغرض استفادہ حاضر ہو تو دنیا سے اپنی بے تعلقی بیان ہوگی۔ اور چند حکایات نقل محفل ہوں گے کہ فلاں بادشاہ یا امیر یا تاجر وغیرہ نے ہمیں یہ دینا چاہا۔ مگر ہم نے نہ لیا۔ ہمیں دنیا داروں کی کچھ پروا نہیں۔ ہمکو تو خاص خدائے تعالیٰ سے تعلق ہے۔ ہمارے نزدیک

بادشاہ اور غریب دونوں یکساں ہیں۔ پھر مریدوں میں ان حکایات کے چرچے ہوتے ہیں جس سے عام شہرت ہوتی ہے۔ اور نذر و نیاز کا بازار گرم ہوتا ہے۔ اب فقر اختیاری کا حال بھی تھوڑا سن لیجئے۔ فتوحات مکیہ کے ایک سو اٹھاونویں باب میں لکھا ہے کہ اولیاء اللہ لذت کی چیزوں کو جن میں چکنائی اور رطوبت ہوتی ہے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اُن کے حبیب یعنی خدائے تعالے نے اُنہیں اس امر کی تکلیف دی ہے کہ راتوں کو اُس کے روبرو کھڑے رہیں اور مناجات کریں۔ ایسے وقت میں کہ لوگ نیند کی راحت میں ہوں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ جب رطوبات جسم میں ہوتے ہیں تو اُن کے بخارات دماغ کی طرف چڑھتے ہیں جن سے حواس میں تخدّر اور سستی پیدا ہو کر نیند غالب ہو جاتی ہے جو مانع قیام لیل اور مناجات ہے۔ پھر اُن بخارات سے جسم میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ قوت اعضا کو فضول کاموں میں لگاتی ہے۔ جس سے اُن کے محبوب نے انہیں روکا ہے۔ اس لئے وہ کھانا پانی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اگر کھاتے ہیں تو اس انداز سے کہ صرف ہلاکت سے بچ جائیں۔ اس وجہ سے رطوبت اُن کے بدن میں کم ہوتی جاتی ہے اور تازگی و رونق نام کو نہیں رہتی۔ اور جسم لاغر اور اعضا میں استرخا ہو جاتا ہے اور نیند جاتی رہتی ہے اور بیداری قوت پاتی ہے جس سے

ان کا مقصود جو قیام لیل ہے حاصل ہوتا ہے۔ اور اُن کے اوصاف
میں لکھا ہے کہ اُن کی وحشت کا مونس اور اُن کے بیماریوں کا طبیب
خدائے تعالے ہی ہوتا ہے اُن کے ابدان متواضع اور اُن کے ہاتھ
اُسی کی طرف دراز ان کے دل اسی کی طرف مائل و مشتاق رہتے ہیں
اگر انست ہے تو اسی سے اور اگر خوف ہے تو اسی کا۔ راحت اُن سے
مایوس ہے۔ اور غفلت اُن سے دور۔ ہمیشہ وہ تضرع میں رہتے ہیں
اور اپنی خطاؤں سے معافی مانگا کرتے ہیں۔ انتہی۔

اب کہئے کہ جن کی یہ حالت ہو ان کو تعلی اور خودستائی سے کیا
تعلق۔ یہ بات ممکن ہے کہ اما بنعمۃ ربک فحدث کے لحاظ سے
اظہار شکر کرتے ہوں۔ اگر فی الواقع یہی ہو تو اس میں کسیکو کلام نہیں۔ یہ
معاملہ ان کے اور خدا کے درمیان میں ہے۔ مگر قابل غور یہ امر ہے کہ
جس وقت کوئی ایسا شخص جس کی وقعت لوگوں میں ہو اس نے اُن کی
تعظیم و توقیر میں فرق کیا تو غصہ کی حالت میں اپنے استغنا کی حکایتیں
بیان کی جاتی ہیں۔ اور دنیاداروں کی ذلت ایسی طور پر بیان کی جاتی ہے
کہ وہ شرمندہ ہو کر جبری تعظیم پر مجبور ہوتا ہے۔ اور جب اچھی طرح
آؤ بھگت کرنے لگے تو زمرۂ معتقدین میں شریک ہو کر ہر طرح اُس کی
حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

الحاصل فقر اختیاری جن لوگوں کو حاصل ہے وہ بہت ہی شاذ و نادر ہیں باقی اُن کے طفیلی ہیں۔ کسی سے بدگمانی کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں

ہر کرا جامہ پارسا بینی
پارساداں و نیک مرد انگار

یہ کرامت فقر اختیاری کامل طور پر حضرت امام الاولیا علی کرم اللہ وجہہ کو حاصل تھی۔

عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں سخت قحط سالی ہوئی۔ آپ حضرت عباس رض کو لے کر جنگل میں گئے۔ اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔ کہ الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی برکت سے پانی برسا۔ ہنوز لوگ دعا سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ابر نمودار ہوا اور پانی برسنے لگا۔ اور اتنا برسا کہ گھروں کو آنا مشکل ہوگیا۔ یہ حضرت عباس رض کی کرامت خدائے تعالےٰ کے نزدیک تھی کہ اُن کے وسیلہ سے جو دعا کی گئی فوراً مقبول ہوگئی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بارگاہ کبریائی میں عرض کی تھی کہ سعد بن ابی وقاص کا تیر نشانہ پر لگا کرے۔ اور اُن کی دعا مقبول ہوا کرے۔ اس کے بعد جو دعا وہ کرتے قبول ہو جاتی۔ چنانچہ جنگ قادسیہ میں دمل کی وجہ سے وہ شریک جنگ نہ ہوسکے۔ اور اپنی چاندنی پر سے

لڑائی

لڑائی کی حالت دیکھا کرتے۔ کسی نے اس باب میں کچھ گفتگو کی۔ اور وہ خبر آپ کو پہنچی۔ آپ نے کہا۔ الٰہی اس کی زبان اور ہاتھ سے ہمیں بچا فوراً وہ گونگا اور اُس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ عمرؓ نے کہا تھا کہ جس حاکم کی کوئی شکایت کرے میں اُسے معزول کر دونگا۔ سعد بن ابی وقاصؓ کی شکایت ہوئی۔ آپ نے اُنہیں معزول کر کے عمار بن یاسر کو ان کی جگہ بھیجا اور ایک شخص کو روانہ کیا کہ اہل کوفہ سے اُن کا حال دریافت کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے کوفہ کے کل مساجد کے مصلیوں سے دریافت کیا۔ سب نے اُن کی تعریف و توصیف کی۔ مگر مسجد بنی عبس میں جب اُنہوں نے اور لوگوں سے پوچھا تو ایک شخص کہنے لگا کہ سعد لشکر کے ساتھ نہیں جاتے تھے۔ اور تقسیم برابر نہیں کرتے تھے۔ اور فصل قضایا میں عدل نہیں کرتے تھے۔ سعدؓ نے فرمایا میں بھی تین دعائیں کرتا ہوں۔ کہ الٰہی اگر یہ شخص جھوٹا ہے تو اُس کی عمر دراز کر۔ اور اُس کے فقر و احتیاج کو دراز کر۔ اور اُس کو فتنوں میں مبتلا کر۔ راوی حدیث کہتے ہیں کہ میں نے اُس کو دیکھا ہے کہ اتنا بوڑھا ہوا کہ اُس کے بھوؤں کے بال آنکھوں پر گرتے تھے۔ اور لونڈیوں کو راستوں میں چھیڑتا۔ اور جب اُس سے پوچھا جاتا تو کہتا کہ یہ ایک فتنہ ہے جو سعد کی دعا کا اثر ہے۔

ابن عمر رضہ سفر میں تھے کہ یکایک شور ہوا کہ راستہ میں شیر بیٹھا
ہے جس کے خوف سے راستہ بند ہو گیا تھا۔ آپ نے نزدیک جا کر اس سے
کہا کہ راستے سے ہٹ جا۔ یہ سنتے ہی وہ دُم ہلا کر چلا گیا۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علا ابن الحضرمی رضہ کو لشکر دیکر بھیجا سمندر
بیچ میں حائل تھا۔ مگر وہ دعا کرتے ہوئے اس کے پانی پر سے گذر گئے
خالد رضہ نے زہر پی لیا۔ مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ چند کرامات
صحابہ کے تھے۔ اس سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ صحابہ سے کرامات
صادر ہوتے تھے۔ اب رہی یہ بات کہ جس طرح مابعد کے اولیاء اللہ
کی کرامتیں بکثرت ہیں اتنی صحابہ کی نہیں۔ اس کے اسباب امام
سبکی رحمہ نے لکھا ہے۔ چونکہ یہاں صرف اثبات کرامات کا ذکر ہے
اس لئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
اس تمام کا ماحصل یہ ہے کہ خواہ معجزہ ہو یا کرامت یا امور عادیہ
سب کا وجود اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے
مگر بعض اشیاء میں کسی قسم کی عادت ہے اور بعض میں کسی قسم کی
عادت کے خلاف کوئی چیز دیکھی جاتی ہے تو خرق عادت سمجھی جاتی
ہے اور لوگ تعجب کی نظر سے اس کو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ وہی چیز
بعض کے یہاں عادی ہوتی ہے۔ مثلاً آدمی سامنے رکھ کر نظروں سے

غائب ہو جائے تو خرق عادت سمجھی جائے گی۔ اور جن ہمیشہ نظروں سے غائب رہتے ہیں اور کبھی نظر بھی آجاتے ہیں اُن کے یہاں یہ امر قابل تعجب نہیں چنانچہ آکام المرجان میں اعمش سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قبیلۂ بجیل کے ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ایک لڑکی ہمارے یہاں تھی۔ اُس سے جن کو تعلق پیدا ہوا۔ اُس نے کہا کہ میں مکروہ سمجھتا ہوں کہ ناجائز تعلق اُس سے رکھوں۔ اس لئے اُس کے ساتھ نکاح کر دیا جائے۔ چنانچہ نکاح کر دیا گیا۔ ہم نے پوچھا کہ تم لوگوں کو کونسا کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کہا۔ چانول۔ ہم نے چانول پکا کر اُس کی دعوت کی۔ جب کھانا رکھا گیا تو صرف لقمے اُٹھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اور کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ ایک روز وہ ظاہر ہوا۔ ہم نے کہا کہ تم کس قسم کے لوگ ہو۔ کہا تم جیسی ایک امت اور گروہ ہیں، جسطرح۔ تم میں قبائل ہوا کرتے ہیں۔ ہم میں بھی ہیں۔ ہم نے کہا کیا اہل ہوا بھی تم میں ہیں۔ کہا ہاں۔ ہر فرقہ کے لوگ یعنی قدریہ شیعہ۔ مرجیہ ہیں۔ ہم نے پوچھا۔ تم کس فرقہ کے ہو۔ کہا مرجیہ کہا رافضیوں کو تم لوگ کیسے سمجھتے ہو۔ کہا سب سے بدتر۔ انتہیٰ۔

اس سے کئی امور معلوم ہوئے۔ اُن کا اشکال بدلنا، اور صلاح و تقویٰ، اور مذاہب کی پابندی، اور نگاہوں سے غائب رہنا اور

جب جی چاہے نظر آ جانا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا شکل بدلنا ایسا ہے
جیسے ہم لباس بدلتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ لباس جزو بدن نہیں بلکہ
ہماری ذات سے منفک ہے۔ اور اُن کا جسم اُن سے منفک
نہیں۔ اس صورت میں تشکل باشکال اُن کی ماہیت کا خاصہ ذاتی ہوگا
یا خاصۂ لازمی۔ جس طرح ہمارے لئے ناطق ہے۔ ناطق کو فصل قرار
دینے کی ضرورت اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ جتنے انواع حیوانیت میں
شریک ہیں سب سے انسان کو امتیاز ہو جائے۔ اور فی الحقیقت ہر اعتبار
سے یہی لفظ ممتاز کرنے والا تھا۔ اگر بات کرنے کی صفت لی جائے تو
کسی جانور میں نہیں۔ اور اگر دریابندگی معقولات خیال کی جائے تو بھی یہ
صفت جس طرح آدمی میں ہے جانور میں نہیں۔ آدمیوں کے افکار
سے کروڑہا کتابیں اور دفاتر بھرے ہوئے ہیں۔ اور جانوروں کو ادراک
ہے بھی تو محدود جو اُن کی بسر برد اوقات کے لئے کافی ہو سکے۔ یہ معلوم
نہیں ہوتا کہ جنوں کی بھی تصانیف ہیں یا نہیں۔ مگر امام شعرانی رح کے ایک
رسالہ سے معلوم ہوا کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ چنانچہ اُس میں لکھا
ہے کہ میرے پاس ایک کاغذ پہنچا۔ جس میں لکھا تھا کہ ہم لوگ بعض امور
میں آپ لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ چند سوالات جو لکھے
گئے ہیں اُن کے جوابات لکھکر فلاں مقام میں رکھدو۔ اور جواب اگر نظم میں

ہو تو مناسب ہے۔ کیونکہ ہم لوگوں کو شعر کے ساتھ بالطبع مناسبت ہے
چنانچہ امام رحمہ نے ایک رسالہ نظم میں لکھکر رکھدیا۔ جس کو ایک بلی لے گئی۔
آکام المرجان میں لکھا ہے کہ اُبی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ ایک
قوم بارادۂ مکۂ معظمہ نکلی۔ کسی جنگل میں سب نے راستہ بھول کر اس قدر
پریشانی اُٹھائی کہ موت کی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ اور کفن پہن کر
لیٹ گئے۔ ایک شخص جھاڑی میں سے نکلا اور کہا میں ان جنوں میں سے
ہوں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا تھا۔ اور میں نے
حضرت سے یہ بھی سنا ہے کہ المؤمن اخو المؤمن ودلیلہ
لایخذلہ یعنی ایک ایماندار دوسرے ایماندار کا بھائی اور اُس کو
راہ دکھانے والا ہے بُرے وقت میں اُس کو مخذول نہ کرے یعنی
اُس کی مدد کرنی چاہیئے۔ اُس کے بعد کہا کہ پانی قریب ہے۔ چنانچہ
ان کو ہمراہ لے کر پانی پر پہنچا دیا۔
اسی طرح اور کئی واقعات نقل کئے ہیں جن میں احادیث کا بیان
کرنا اور اُن پر عمل کرنا مذکور ہے۔

غرض کہ اتنا ثابت ہے کہ جن میں علما ہوتے ہیں۔ اور قوت فکریہ
بھی اُن کو دی گئی ہے۔ اس صورت میں اُن کو حیوان ناطق کہنے میں
کوئی تامل نہیں۔

حکما نے دیکھا کہ اگر واقع میں جن کا وجود ہو بھی جیسا کہ اکثر فلاسفہ اس کے
قائل ہیں۔ تو چونکہ وہ نظر نہیں آتے۔ اس لئے اُن کی حقیقت اور ماہیت
کو نظر انداز کر دیا۔ ورنہ انسان کی ماہیت حیوان ناطق کبھی قرار نہ دیتے
حکمت میں چونکہ امور واقعیہ سے بقدر طاقت بشری بحث ہوتی ہے
اور جن کا وجود خارجی ہے۔ مشاہدات سے ثابت ہے کہ جس کے
علمائے یورپ قائل ہو چکے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے اب
انسان کی ماہیت حیوان ناطق نہیں ہو سکتی۔ اب تک جو فصل کہی جاتی
تھی یعنی "ناطق" وہ عرض عام ہو گئی۔ اور فصل کوئی دوسری مقرر کرنے کی
ضرورت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فلسفہ لاحق افکار سے کتنا ہی مستحکم
بنایا جائے قابل اعتماد ہو نہیں سکتا۔ اور عقلا نے جو حقائق اشیاء
قرار دئے ہیں وہ قطعی نہیں ہو سکتے۔ ہر چیز کی حقیقت وہی جانتا ہے
جس نے اُن سے پیدا کیا۔ اسی وجہ سے بزرگان دین کی دعا ہے۔
اللّٰھم ارنا حقایق الاشیاء کما ھی۔

آکام المرجان میں لکھا ہے کہ علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر
حنبلی نے لکھا ہے کہ مکہ معظمہ میں نہر جو جاری کی گئی اُس کا یہ واقعہ ہے
جس کی خبر مجھے امام حنابلہ نے دی جن کے ہاتھ پر نہر کا کام انجام پایا
اُنہوں نے کہا جب ایک خاص مقام تک نہر کھودی۔ نہر کھودنے والا بیہوش

ہو گیا

ہو گیا اور کچھ بات نہیں کر سکتا تھا۔ بہت دیر تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر غیب سے ایک آواز آئی کہ اے مسلمانو تم کو حلال نہیں کہ ہم پر ظلم کریں۔ میں نے کہا ہم نے کیا ظلم کیا۔ کہا ہم یہاں کے رہنے والے ہیں۔ خدا کی قسم سوائے میرے یہاں کوئی مسلمان نہیں۔ میں نے سب کفار کو زنجیروں میں جکڑ دیا ہے ورنہ وہ تمہیں سخت صدمہ پہنچاتے انہوں نے مجھے تمہارے طرف بھیجا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس زمین میں سے ہم تمہیں پانی ہرگز لے جانے نہ دیں گے۔ جب تک کہ تم ہمارا حق نہ دو۔ میں نے کہا تمہارا حق کیا ہے کہا ایک بیل لو اور اس کو اعلیٰ درجہ کی زینت سے آراستہ کر کے مکہ میں سے اس کا جلوس نکال کر اس مقام تک پہنچا دو۔ پھر اس کو ذبح کر کے اس کا سر اپنا اور خون میں شعید الصھریا ڈال دو اور باقی کے تم مختار ہو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو ہم اس نہر کو کبھی جاری ہونے نہ دیں گے۔ میں نے قبول کیا۔ یہ کہتے ہی اس شخص کو جو بیہوش پڑا تھا افاقہ ہو گیا۔ دوسرے روز جب میں صبح کی نماز کے واسطے مسجد کو جانے کی غرض سے اترا تو دیکھا کہ ایک شخص دروازہ پر کھڑا ہے اس نے مجھے کہا کہ میں نے آج خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑے بیل کو اقسام کے زیور و لباس سے آراستہ و پیراستہ کر کے شان و شوکت سے خلیفہ کے گھر پہلے گئے اور وہ اس کو

ہانکتا ہوا تجمل کے ساتھ مکہ معظمہ کے باہر لے گیا۔ اور اُس کو ذبح کر کے
اُس کا سر اور پائے کو کسی کنویں میں ڈالدئے۔ مجھے اس خواب سے تعجب
ہوا اہل مکہ کے رودار لوگوں سے بیان کیا۔ چنانچہ سب نے ایک بیل خرید
کر کے اُسے زینت ولباس سے آراستہ کیا۔ اور تجمل سے اُس مقام تک
لیے جاکر ذبح کیا اور جس کنویں کی نشاندھی کی گئی تھی۔ اُس میں اُس کا سر
اور پائے اور خون ڈالدیا گیا۔ اُس وقت تک پانی کا پتا نہ تھا۔ خون وغیرہ
کنویں میں ڈالتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ کسی شخص نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک
مقام پر کھڑا کر دیا۔ اور کہا یہاں کھود و جب وہاں کھودا گیا تو پانی اس
کثرت سے نکلا کہ موجیں مارنے لگا اور ایک نہر نمایاں ہوئی۔ جس میں
سوار جا سکتا تھا۔ ہم نے اُس کو صاف کیا۔ اس کثرت سے اُس میں
پانی جاری ہوا کہ اُس کی آواز سنی جاتی تھی۔ اور چار ہی روز میں نہر مکہ
معظمہ میں جاری ہو گئی۔

علامہ شمس الدین رہ نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ نظیر اس واقعہ کی ہے
کہ ایک لڑکی زیور ولباس سے آراستہ کر کے نیل میں ڈالی جاتی تھی۔
عمر رضہ نے اس رسم کو بالکل موقوف فرمادیا۔ اس واقعہ میں بھی کوئی عمری
مشرب ہوتا جس سے شیطان ڈرتے تو نہر جاری ہو جاتی اور ایک
چڑیا کو بھی ذبح کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن ہر زمانہ کے لوگ جدا

ہیں لکھا ہے کہ اس واقعہ کو بیان کرنے والے نہایت سچے اور دیندار اور بڑے متدین شخص تھے۔ جن کی صدق و دیانت پر تمام اہل شہر گواہی دیتے ہیں۔ انتہیٰ۔

آکام المرجان میں اسی واقعہ میں لکھا ہے کہ وہب کہتے ہیں کہ کسی خلیفہ نے چشمہ جاری ہونے کے لئے جن کے لئے جانور ذبح کیا۔ اور لوگوں کو کھلایا۔ جب یہ خبر ابن شہاب کو پہونچی تو انہوں نے کہا کہ یہ ذبح کرنا اُنکو حلال نہ تھا اور لوگوں کو جو کھلایا اُس کا کھانا ان کو حلال نہ تھا۔

یہاں وما اہل بہ لغیر اللہ کی بحث پیدا ہوتی ہے جو ہندوستان میں ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہو گیا ہے کہ اس قسم کے ذبیحہ کو بعض حلال کہتے ہیں اور بعض حرام۔ طرفین سے اس مسئلہ میں رسالے لکھے گئے ہیں اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اُس زمانہ میں بھی مختلف فیہ تھا کیونکہ علمائے مکہ معظمہ نے اُس کو جائز رکھا اور ابن شہاب رح نے حرمت کی رائے دی۔

بہرحال جنوں کے مختلف حالات ہیں اگر وہ سب لکھے جائیں تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ اس لئے انہی چند حالات پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا گیا۔ من الجنۃ والناس کے معنی میں اختلاف ہے۔ قول صحیح یہی ہے کہ وہ بیانِ وسواس ہے یعنی وسوسہ انداز جن بھی

ہوتے ہیں اور آدمی بھی - اُن سے میں پناہ مانگتا ہوں -

ابن تیمیہ رح نے تفسیر معوذتین میں یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نعوذ باللہ من شیاطین الانس والجن ابوذر رض نے پوچھا کیا آدمی بھی شیاطین ہوتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا ہاں شیاطین جن سے بھی وہ بدتر ہیں انتہی -

بدتر ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ شیاطین انس دوستی کے پیرایہ میں ہوتے ہیں اور ہمجنس ہونے کی وجہ سے آدمی اُن کی طرف مائل بھی ہوتا ہے کما قیل الجنس یمیل الی الجنس شیاطین انس ہی ہوتے ہیں جن کی طبیعت بُرے کام اور شر و فساد کی طرف مائل ہوتی ہے - جو لوگ اون کی صحبت اختیار کرتے ہیں اُس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اُن کو بھی اپنا ہم مشرب بنا سکے - پھر ہر ہر نفس کا یہی لازمہ ہے کہ کچھ نہ کچھ وسوسے ڈالتا رہتا ہے جیسا کہ اس آیۂ شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کقولہ تعالے ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ یعنی نفس جو وسوسہ ڈالتا ہے اُس کو خدا جانتا ہے اور حدیث شریف سے ثابت ہے کہ آدمی کا نفس سب دشمنوں سے بڑا دشمن ہے - پہلے تو نفس ہی خود وسوسہ انداز ہے پھر جب شیاطین الانس سے صحبت اور رفاقت حاصل ہو تو پھر کیا کہنا ظلمات بعضہا

فوق بعض کا مضمون صادق آجاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئیے کہ صلحا کی صحبت اختیار کرے۔ تاکہ اُن کی صحبت کی برکت سے نفس کے خیالات درست ہوجائیں اور اچھے وسوسے ڈالنے لگے۔ احادیث میں اہل بدعت وہوا کی صحبت سے سخت ممانعت وارد ہے اُس کی یہی وجہ ہے کہ جب آدمی ان کی صحبت میں بیٹھے گا وہ ضرور وسوسے ڈالینگے جس سے اس کا نفس متاثر ہوکر اُن کا ہم خیال ہوجائیگا۔ چنانچہ یہ امر مشاہد ہے کہ کیسا ہی بے اصل اور خلاف عقل ونقل مذہب ایجاد کیا جاتا ہے۔ لوگ اُس میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ اور وساوس شیاطین الانس ایسے راسخ ہوجاتے ہیں کہ قرآن وحدیث بھی اُن کے روبرو پڑھے جائیں تو اُن کو جنبش نہیں ہوتی۔ مذہب سے غرض اصلی یہ ہے کہ آدمی اُس کا پابند ہونے کی وجہ سے بعد مرنے کے ہمیشہ راحت و آسایش میں رہے۔ اتنی بڑی دولت مفت میں حاصل نہیں ہوسکتی اس کے لئے بڑی کوشش درکار ہے جب تک آدمی وساوس شیاطین جن وانس سے احتراز نکرے یہ دولت حاصل نہیں ہوسکتی اس کا حقیقی علاج بغیر اس کے کوئی نہیں کہ آدمی پورے طور پر خدائے تعالیٰ کی پناہ میں آجائے جیسا کہ اس سورہ میں صراحۃً ارشاد ہے۔

تمّت بالخیر ۱۲

مسئلۂ وحدۃ الوجود

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ہر چیز پیدا ہونے سے پہلے معدوم ہوتی ہے اور جس وقت پیدا ہوتی ہے یکایک محسوس ہو جاتی ہے اب یہاں دیکھنا یہ ہے کہ کس چیز نے اُسے محسوس بنا دیا اور وہ کیا چیز ہے جس کے نہ ہونے سے وہ معدوم تھی اور اُس کے ہونے سے محسوس ہو گئی ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ وجود ہی ہے جو حالت عدم میں اُس چیز کو نہ تھا اور جب دونوں میں باہمی تعلق ہوا تو وہ چیز محسوس اور موجود ہو گئی۔ عقل اس پر گواہی دیتی ہے کہ جو چیز ایسی ہو کہ اُس کے وجود سے معدوم چیز موجود ہو جائے وہ اعتباری نہ ہو گی بلکہ مستقل بالذات

ہو گی اس سے ثابت ہے کہ وجود جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے وہ مصدری
نہیں کیونکہ وجود مصدری ایک اعتباری اور انتزاعی چیز ہے جس کا منشاءِ
انتزاع دوسری چیز ہو گی۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ دوسری چیز نفس شئے
معدوم ہے یا اور کچھ۔ اگر نفس شئے معدوم ہو تو لازم آئیگا کہ معدوم
من حیث ہو معدوم سے وجود خیال میں آئے جو کسی طرح درست
نہیں تو ضرور ہے کہ وہ دوسری شئے منشار انتزاع وجود مصدری کا
ہے وہ نفس وجود ہو گا مگر مصدری نہ ہو گا۔ بلکہ ایسا مستقل ہو گا کہ معدوم
شئے کو وجود دے سکے اور منشار انتزاع اس کے موجودیت کا بنے۔
غرضکہ یہ وجود وجود مصدری کا منشار انتزاع ہے اور خارج میں موجود
ہے اس وجود کے معنی (ہونا) نہیں ہو سکتے جو معنی مصدری ہے بلکہ
اس کے معنی ما بہ الموجودیت ہے گو اس کی حقیقت سمجھ میں نہ آسکے مگر
اتنا تو ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ ہر شئے معدوم کے موجود ہونے کے وقت
ایک چیز ایسی اس کے ساتھ متعلق ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس پر
موجودیت کا اطلاق ہوتا ہے جب وجود کے معنی معلوم ہوے تو اب ہم جہاں
وجود کہینگے تو اس سے مراد ما بہ الموجودیت لینگے۔ جب آپ یہ سمجھ گئے تو جو معدوم
شئے وجود میں آتی ہے وہاں دو چیزیں ہونگی۔ ایک وہ معدوم جس کو وجود مل
رہا ہے دوسرا وجود جس کی وجہ سے وہ معدوم شئے وجود میں آرہی ہے تو اب تمام

موجودات عالم کا حال معلوم ہو گیا کہ اگر وجود سے قطع نظر کر لیجئے تو وہ سب معدوم ہے۔ اور موجود ہونا اس کا صرف وجود کی برکت سے ہے۔ اب یہاں یہ بات معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ عالم میں بے انتہا چیزیں ہم دیکھتے ہیں جو شکل وشمائل میں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ اس کثرت کا منشار آیا وجود ہے یا وہ معدومات۔ اس میں شک نہیں کہ وجود مصدری میں کثرت ضرور ہے کیونکہ اس کا منشار ہر ایک موجود ہے جو دوسرے سے تشخص میں ممتاز ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وجود خارجی اور اصلی یعنی ما بہ الموجودیت میں کثرت ہے کیونکہ اس کی خاصیت تو یہ ہے کہ جس معدوم کے ساتھ ملا اس کو موجود کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ کثرت اشیار معدومہ میں ہے یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اشیار معدومہ تو معدوم ہیں اور عدم میں امتیاز سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ زید مثلاً جو موجود ہوا حالت عدم میں زید معدوم تھا یعنی عدم محض نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس کو زید معدوم کہنے کی ضرورت ہوئی۔ دیکھئے جب ہم گھر بناتے ہیں تو پہلے اس کا نقشہ ذہن میں لاتے ہیں۔ پھر خارج میں اس کو موجود کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر کہ خارج میں معدوم گھر وجود میں آیا نہ یہ کہ مطلق معدوم یعنی عدم محض مقصود یہ ہے کہ گو گھر خارج میں معدوم ہے مگر عدم محض نہیں اگر عدم محض ہوتا تو یوں کہتے کہ عدم کو ہم نے وجود میں لایا۔ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ معدوم گھر کو ہم نے موجود کیا۔ پھر وہ معدوم گھر جب وجود میں آیا تو جس قدر

آثار و لوازم اس کے خیال کئے گئے تھے اُن سب کا وجود خارج میں آگیا۔

حاصل یہ کہ موجود مگر کے وجود سے اگر قطع نظر کیا جائے تو صرف گھر رہ جائیگا۔ جو قبل وجود معدوم تھا اور بعد وجود موجود ہو گیا۔ اُسی کو اُس گھر کی عین ثابتہ کہیں گے گو کہ حالت عدم میں موجود نہیں مگر من وجہ اُس کو ثبوت کا ایک درجہ حاصل ہے جس کو وجود نہیں کہہ سکتے جب ہی موجود میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایک وجود۔ دوسری عین ثابتہ تو معلوم ہوا کہ کثرت موجودات صرف اعیان ثابتہ کی کثرت سے ہے ورنہ نفس وجود واحد ہے۔ اس کو یوں سمجھنا چاہئیے کہ تمام عالم کے اعیان ثابتہ پر وجود محیط ہے اور وجود اُن پر ایسا ہے جیسے چادر مختلف اشیا پر اُڑھا دی جاتی ہے۔ اور اُن اعیان ثابتہ کا ظہور صرف وجود کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اب تمام عالم کو خیال کر لیجئے کہ کہیں زمین ہے کہیں پانی اور کہیں ہوا اور افلاک وغیرہ اس مجموعہ میں وجود موجود ہے جو ایک ہے مگر ہر ایک چیز کی عین ثابتہ علحدہ علحدہ ہے اور جتنے آثار و لوازم ہر ایک کے ہیں وہ سب ہر ایک کے عین ثابتہ میں مندرج و مندمج ہیں ان کو وجود سے کوئی تعلق نہیں اور تعلق ہے تو اس قسم کا کہ ان کا ظہور بغیر وجود کے ممکن نہیں۔ محققین وجود ہی کو ذات الٰہی کہتے ہیں جو تمام عالم کی مابہ الموجودیت ہے کیونکہ اسی سے ہر چیز کی موجودیت متعلق و وابستہ

ہے گو شریعت میں اس لفظ کا اطلاق ذات الٰہی پر وارد نہیں مگر معنی ضرور صادق آتے ہیں اور عقل بھی اُس کو تسلیم کرتی ہے و العبرۃ للمعنی اس صورت میں زید مثلاً بلکہ تمام عالم معدوم ہے اور موجود ہے تو اس وجہ سے کہ وجود کے ساتھ اس کو ایک تعلق خاص ہے اگر وہ تعلق اُٹھ جائے تو اُس کو پھر کسی طرح موجود نہیں کہہ سکتے۔ اب اگر ظاہر ہے تو وجود ہی ہے کیونکہ معدوم بحیثیت عدم ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اگر اُس کو ظہور ہے تو تعلق وجود کے طفیل سے ہے اس لحاظ سے بندہ اپنے کو نانی اور غیر موجود کہہ سکتا ہے اور اس لحاظ سے کہ وجود کے ساتھ اس کو تعلق خاص ہے اور نظر صرف وجود کی طرف کرے تو ہمہ اوست کا مضمون بھی صادق آتا ہے۔ اسی وجہ سے بزرگان دین کے اقوال دونوں قسم کے وارد ہیں۔ حضرت شیخ اکبر رضی اللہ عنہ نے متعدد مقامات میں فرمایا ہے ما انت ھو بل انت ھو اگر کوئی اس خیال سے کہ وجود واحد ہے اور بزرگان دین نے ہمہ اوست فرمایا ہے اپنی حقیقت جو عین ثابتہ ہے پیش نظر نہ رکھے اور یہ کہے کہ ہمیں عبادت کی ضرورت نہیں تو حضرات صوفیہ کے نزدیک بھی وہ کافر ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے کہ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون اور جگہ جگہ عبادت کی تاکید فرمائی ہے اور نصوص قطعیہ کے انکار سے حضرات صوفیہ کے پاس بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے اور وحدت وجود سے اسکو کچھ نفع

نہ ہوگا۔ کیونکہ باوجود وحدت وجود کے دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ آگ برابر جلاتی ہے اور اُس سے درد و مصیبت ہوتی ہے اسی طرح قیامت میں بھی عذاب الیم ہوگا اگر وحدت وجود کا مقتضے یہ ہوتا کہ کسی کو اذیت اور ضرر نہ ہو تو دنیا میں بھی اذیت نہ ہوتی اور یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وحدت الوجود کا اثر قیامت ہی میں ہوگا۔ کیونکہ وجود دنیا و آخرت میں ایک ہی ہے مقتضائے ذاتی اس کا بدل نہیں سکتا ہاں یہ بات اور ہے کہ کثرت عبادت سے کنت سمعہ و بصرہ کے مقام تک پہنچ جائے لیکن وحدت الوجود سے کوئی تعلق نہیں وہ کثرت عبادت کا ثمرہ ہے۔ ھذا من افادۃ العالم العارف باللہ مولانا الحافظ الحاج المولوی محمد انوار اللہ مدظلہ العالی وعم فیضہ المتعالی بدوام الایام واللیالی فی اثبات وحدۃ الوجود

مسئلۂ خلق افعال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔ اہل علم پر پوشیدہ نہیں کہ مسئلہ خلق افعال ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اور اس کے سمجھنے میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں چونکہ شرع شریف میں مسئلہ مہتم بالشان ہے اور اکثر حضرات اس میں ایسی گفتگو کرتے ہیں کہ شریعت سے دور جا پڑتے ہیں اس لئے یہ چند اوراق بغرض خیر خواہی اہل اسلام لکھے جاتے ہیں ناظرین سے توقع ہے کہ تاوقتیکہ اول سے آخر تک بنظر غامض اسکو ملاحظہ نہ فرمالیں۔ اعتراض کی فکر میں مشغول نہ ہوں وما علینا الا البلاغ۔

علما نے لکھا ہے کہ جب ابتداءً کسی کام کے کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کو ہاجس کہتے ہیں اور تھوڑا سا قرار و قیام ہونے پر اُس کا نام خاطر ہوتا ہے۔ پھر اگر اس کے کرنے یا نہ کرنے میں تردد ہو تو اس کو حدیثِ نفس کہتے ہیں۔ اور اگر کرنے کی جانب کو ترجیح

ہوجائے تو وہ ہم ہے اور جب پورا قصد کر کے وہ کام شروع کردیا جائے تو اُس کو عزم کہتے ہیں۔ یہاں تک تو مدارج اُس خیال کے ہوئے جو ابتداءً دل میں پیدا ہوتا ہے اس کے بعد فعل جس قسم کا ہو (خواہ جوارح سے متعلق ہو یا دل سے) شروع ہو جاتا ہے اور جب تک وہ کام ختم نہ ہو قصد باقی رہتا ہے اگرچہ بظاہر اُس خیال ابتدائی کے ساتھ فعل کو چنداں مناسبت نہیں۔ مگر یہ تو ظاہر ہے کہ دونوں میں علم ومعلوم کی نسبت ہے اور دونوں آدمی کے حالات ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ وہ کیفیت علمیہ ہے اور یہ حالت جوارح وغیرہ اور وہ بمنزلہ تخم ہے اور یہ بمنزلہ درخت۔ جس طرح درخت بغیر تخم کے نہیں ہوسکتا اُسی طرح فعل اختیاری بغیر اُس خیال کے نہیں ہوسکتا اور جیسے تخم بغیر وجود شرائط کے درخت نہیں بنتا ویسے ہی وہ خیال بغیر وجود شرائط کے فعل کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا اگرچہ بظاہر تخم وشجر میں کوئی مناسبت نہیں ہے اس لئے کہ وہ خشک ہے اور یہ تروتازہ وہ جماد ہے اور یہ نامی، اس میں رگ وریشہ وبرگ نہیں ہے، اور اُس میں سب کچھ ہے وہ بدرنگ بے رونق اور بے مزہ ہے اور یہ خوشرنگ خوش ذائقہ اور خوشبودار ہے۔

باوجود اس کے عقل گواہی دیتی ہے کہ وہی تخم خشک بسبب وجود شرائط کے درخت ہو رہا ہے۔ اسی طرح اگر غور کیا جائے تو وہی خیال اولیں جو درجۂ ہاجس میں تھا بسبب وجود شرائط کے صورتیں بدلتا ہوا گویا فعل بن رہا ہے۔

اب اس سلسلے پر غور کرنا چاہیئے کہ ابتدائے وجود خیال سے انتہائے وجود فعل تک آدمی کے اختیار اور قوت کو کہاں تک دخل ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ ابتداءً جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ اختیار سے خارج ہے اس لئے کہ جب کوئی نیا خیال

آتا ہے تو اچانک آتا ہے بسا وقت آدمی چاہتا ہے کہ کوئی خیال ہی نہ آئے مگر وہ
آہی جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خیالات کے باب میں آدمی کس قدر مجبور ہے۔ یہ
وجدانی دلیل تھی عقلاً اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ خیال ابتدائی قبل وجود ممکن ہے
یعنی نہ اس کا وجود ضروری ہے نہ عدم اور یہ مسلم ہے کہ ممکن جب تک بسبب
ترجیح جانب وجود کے واجب بالغیر نہیں ہوتا وجود میں نہیں آسکتا۔ پھر یہ بھی
بدیہی ہے کہ ممکن سے واجب صادر نہیں ہوسکتا کیونکہ علت کا مرتبہ معلول
سے ارفع ہوتا ہے اسی وجہ سے ممکن نہیں کہ اس خیال کا وجود اس شخص سے
یا کسی دوسرے ممکن سے ہوسکے تو ضرور ہوا کہ وہ اپنے وجود میں مثل اور ممکنات
کے واجب تعالیٰ کی طرف محتاج ہو اور جب تک حق تعالیٰ اُس کو وجود
عطا نہ فرمائے وہ موجود نہ ہوسکے۔

ایک واضح دلیل اس دعوے پر یہ ہے کہ اگر اس ابتدائی خیال کو آدمی اپنے اختیار
سے پیدا کرتا ہوتا تو چاہیے تھا کہ پہلے اُس خیال کا خیال بھی آتا کیونکہ جو کام اختیار
سے کیا جاتا ہے اس کو پہلے سے جان لینا ضرور ہے تاکہ وہ سوچ اور سمجھ کر
کیا جائے۔ پھر وہ خیالِ خیال بھی اختیاری ہوتا تو اُس کا بھی خیال پہلے
ہی سے ہونا چاہیے علیٰ ہذا القیاس یہ سلسلہ غیر متناہی جاری ہو جائے گا جو
باطل ہے کوئی عاقل یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ ایک خیال کے واسطے اتنے خیالات
یا چند ہی خیالات پہلے ہی سے موجود ہو جاتے ہوں اس سے ثابت ہے کہ جو
خیال آتا ہے وہ بلا اختیار آتا ہے۔ غرض ان دلائل سے ثابت ہے کہ ہر جس
محض بخلقِ خالق ہے۔ علامہ صدر الدین شیرازی نے اسفار اربعہ میں محققین حکما کا

قول نقل کیا ہے کہ قول المحققین منہم ان المؤثر فی الجمیع ہو اللہ بالحقیقۃ۔

پھر اس کا ثابت و باقی رکھنا بھی خدائے تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ کیونکہ آدمی کسی چیز کو معدوم محض نہیں کر سکتا۔ البتہ کسی چیز کی صورت بدل سکتا ہے۔ جب اعدام پر آدمی کی قدرت نہ ہوئی تو وجود اس کا بحفظ الٰہی اپنی حالت اصلی پر باقی رہیگا۔ جب تک خدائے تعالیٰ اسکو خود معدوم نکرے اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہر وقت کے ہاجس حرف خدائے تعالیٰ کی خلق سے ہیں تو ممکن تھا کہ جب تک حدیث نفس کی نوبت پہنچے کوئی دوسرا ہاجس پیدا ہو جاتا جس سے وہاں تک کی نوبت ہی نہ پہنچتی۔ اس ہاجس کو اس درجہ تک نشو و نما دینا بھی خدا ہی کا کام ہوا اس کے بعد جب تردد کی نوبت پہنچتی ہے جو حدیث نفس ہے اُس کی کیفیت یہ ہے کہ کبھی تو جانب فعل کی راجح ہو جاتی ہے اور کبھی ترک کی۔ اگرچہ یہ دونوں کیفیتوں کے مجموعے کا نام حدیث نفس ہے مگر علیحدہ علیحدہ دونوں جانبوں کو دیکھئے تو وہاں بھی وہی ہاجس کی سی کیفیت ہے کہ یکایک کبھی فعل کی ترجیح ہو جاتی ہے۔ پھر ترک کی پھر فعل کی ہر ایک کیفیت کا حدوث بلا اختیار ہوتا ہے جس کی خلق بسبب دلائل سابقہ حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے گو منشا اس کا ہر جانب کے منافع و مضار کا خیال ہوتا ہے مگر اس خیال کی بھی وہی کیفیت ہے جو ہاجس کی تھی کیونکہ جب منافع و مضار دونوں اس میں ہوں تو پہلے دونوں میں سے کسی ایک کے لئے مرجح چاہیئے اور وہ آدمی نہیں ہو سکتا ورنہ تسلسل لازم آئیگا جس کا حال اوپر گذرا اس سے معلوم ہوا کہ وہ خیال نفع یا ضرر جو حدیث نفس میں

پہلے آیا وہ بھی مثل ہا جس کے بتخلق آلہی ہوگا اسیطرح دوسرا خیال پھر اس کے بعد ہم وعزم پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ان ہی دلائل سے مخلوقِ خالق ہیں کیونکہ ان کا وجود بھی حادث ہے۔ الحاصل یہ تمام سلسلہ عزم وقصد تک بتخلیقِ خالق ہونا دلائلِ عقلیہ ونقلیہ سے ثابت ہے۔

پھر عزم کے متصل فعل شروع ہوتا ہے اسکی کیفیت حکما کے پاس یہ ہے جسکو شیخ نے قانون میں لکھا ہے۔

حرکت ارادی جو اعضا سے متعلق ہے اسکی تکمیل اسوقت سے ہوتی ہے جو دماغ سے بواسطۂ اعصاب اعضا میں پہنچتی ہے اُسکی صورت یہ ہے کہ عضلات جو اعصاب اور رباطات وغیرہ پر مشتمل ہیں جب سمٹ جاتے ہیں تو وتر (جو رباط وعصب سے ملتئم اور اعضا میں نفوذ کیے ہوئے ہی کھنچ جاتا ہے) جس سے اعضا بھی کھنچ جاتے ہیں اور جب عضلہ منبسط ہوتا ہے تو وتر ڈھیلا ہوجاتا ہے اور عضو دور ہوجاتا ہے۔ انتہیٰ۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ نفس ادراک کے بعد کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو عضلات کو جو جسم آدمی میں پانسو انتیس (۵۲۹) ہیں کشش وغیرہ دیکر کسی عصب خاص کے ذریعے سے جو ستر (۷۰) ہیں جس عضو کو چاہتا ہے خاص حرکت دینا، جس سے فعلِ مطلوب وقوع میں آتا ہے

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ نفس کو سر سے پاؤں کو جس عضو کو حرکت دینا ہو تو ضرور ہے کہ پانسو انتیس (۵۲۹) عضلات اور ستہتر (۷۷) عصب سے اُس عضلے اور اُس عصب کو حرکت دینا ہوگا جو اس خاص عضو سے متعلق اور یہ ظاہر ہے کہ قبل اس کے کہ کسی عضلے اور عصب کو حرکت دیں اسکو معین کرنیکی ضرورت ہے تاکہ خاص اسی کو حرکت دیجائے جس کی طرف توجہ ہے اور یہ معین کرنا اس بات پر موقوف ہے کہ پیشتر تمامی اعصاب و عضلات کو بالتفصیل جان لے اس کی مثال بعینہ ایسی ہوگی جیسے لکھنے کے وقت قلم کو حرکت دینے کیواسطے پہلے چند انگلیوں کو معین کر لیتے ہیں جس سے قلم کو حرکت دینا ہوتا ہے۔ پھر ان انگلیوں کو ارادے اور اختیار سے حرکت دیتے ہیں جس سے قلم کو حرکت ہوتی ہے۔ اس موقع میں ہم اہل انصاف سے درخواست کرتے ہیں کہ جس عضو کو چاہیں بکرات ومرات حرکت دیکر بغور وتعمق اپنے وجدان سے دریافت کریں کہ اس اختیاری حرکت کے وقت کوئی عضلہ یا عصب کی طرف نفس کی ذاتی توجہ بھی ہوتی ہے یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندر کوئی عضلہ یا عصب بھی ہے یا کسی چیز کو ہم کھینچتے ہیں جس سے وہ عضو کھنچتا ہے۔ کوئی اس کی گواہی نہیں دے سکتا کہ اندرونی کیا کیفیت ہے اور وہ عضلات واعصاب کیونکر کھچتے ہیں۔ میری دانست میں اگر کوئی پوری پوری وجدانی حالت کی

ایمان سے خبر دے تو یہی کہیگا کہ اعصاب وعضلات کو میں تو نہیں کھینچتا
ہاں اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم فلاں عضو کو حرکت دینا چاہتے ہیں۔ پھر
ہوتا یہ ہے کہ ادھر توجہ ہوئی اور اُدھر اسکو حرکت ہوگئی۔ یہاں یہ کہنا
بے موقع نہو گا کہ عصب وعضلے کو حرکت دینا بھی ہمارے اختیار سے
خارج ہے۔ کیونکہ اختیاری حرکت ہوتی تو اس کا علم اور ارادہ بھی ضرور
ہوتا اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ حرکت کا ارادہ بعینہ عصب وعضلے کی حرکت
کا ارادہ ہے۔ اس لئے کہ جب ہمارے وجدان ہی میں نہیں کہ عصب
کوئی چیز بھی ہے تو پھر یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی حرکت کا ارادہ ہوا
پھر جب بحسب تحقیق حکماے اطباسے یہ ثابت ہی کہ بغیر عضلات
و اعصاب کی حرکت کے کوئی عضو حرکت نہیں کر سکتا تو ضرور ہوا کہ وہی
ملتفت الیہ بالذات ہوں گو مقصود بالذات اُن کی حرکت نہو۔ یہ ہاتھ
پاؤں کے افعال سے متعلق بحث تھی۔ اب آنکھوں کے فعل کا حال سنئے
کر دیکھنے کے وقت حدقوں کو ایک مناسبت کے ساتھ پھیرنے کی ضرورت
ہوتی ہے اسوجہ سے کہ جب تک خطوط شعاعی دونوں آنکھوں کے مرئی
پر نہ ڈالے جائیں وہ شے ایک نظر نہ آئے گی۔ کیونکہ ہر ایک آنکھ مستقل
دیکھتی ہے۔ اسی وجہ سے احول دو دیکھتا ہے پھر وہ دونوں خطوط جب
مرئی پر جا پڑتے ہیں تو اُن دونوں کے ملنے سے وہاں ایک زاویہ

پیدا ہوتا ہے یہ زاویہ جس قدر کشادہ ہوگا مرئی بھی اسیقدر بڑی نظر آئیگی۔ اور جس قدر تنگ ہوگا اسیقدر چھوٹی نظر آئیگی۔ اسی وجہ سے کسی چیز کو نزدیک سے دیکھیں تو بڑی اور دور سے دیکھیں تو چھوٹی نظر آتی ہے۔ اسکی تفصیل ہم نے کتاب العقل میں کسیقدر شرح و بسط سے لکھی ہے یہاں صرف اسقدر بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ جب مرئی کے ایک نظر آنیکا مدار دونوں خطوط شعاعی کے ملنے پر ہے تو مرئی جسقدر دور یا نزدیک ہوتے جائیگی حدقوں کی وضع بھی بدلتی جائے گی یہاں تک مرئی بہت ہی نزدیک ہوجائیگی۔ تو حدقے بھی بالکل ناک کی جانب ہوجائیں گے اور جب وہ بہت دور ہوجائے گی تو وہ کان کی جانب مائل ہوجائیں گے۔

اب ہم دیکھنے والوں سے پوچھتے ہیں کہ ایک گز یا ہاتھ کے فاصلہ پر حدقے کو کسقدر مائل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کو اپنے وجدان سے بیان کریں اور اگر وجدان یاری نہیں دیتا تو کسی حکیم ہی کے قول سے ثابت کردیں کہ اس قدر فاصلے پر کوئی چیز ہو تو حدقوں کو اس وضع پر رہنا چاہیئے۔ اور اس قدر فاصلے پر ہو تو۔ اتنی حرکت دینا چاہیئے حالانکہ ہم جب کسی چیز کو دیکھنا چاہتے ہیں تو بغیر اس کے کہ ہم کو اسکا طریقہ معلوم ہو یہ سب کچھ ہوجاتا ہے اِدھر ہماری توجہ ہوئی اُدھر آنکھوں نے

اپنے موقع پر نشست باندھ لی اور نفس ناطقہ کو خبر بھی نہیں کہ یہ کام کس نے کیا
علیٰ ہذا القیاس بات کرنے اور پڑھنے کے وقت حلق و زبان وغیرہ کے عضلات
و اعصاب کو کھینچنا اور ڈھیلے چھوڑنا اور ہر ہر مخرج پر لگانا بغیر اس علم
کے کہ کہاں کونسا عضلہ اور کہاں کونسا عصب ہے۔ دلیل واضح ہے
اسپر کہ ہمارے اختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ اگر کہا جائے کہ فعل
طبیعت سے صادر ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ حکما نے تصریح کر دی ہے کہ
طبیعت بے شعور محض ہے پھر اس کو کیونکر خبر ہوئی کہ نفس فلاں چیز کو
دیکھنا چاہتا ہے اور وہ چیز اسقدر فاصلے پر ہے اور نفس نے فلاں عبارت
پڑھنی چاہی۔ اگر نفس طبیعت کو یہ سب بتا دیتا ہے تو یہ خلاف بداہت
اور وجدان ہے۔ اور بالفرض اگر تسلیم بھی کیا جائے تو خلاف تحقیق حکما ہے
اس لئے کہ نفس اُن کے ہاں ادراکات جزئیہ مادیہ نہیں کر سکتا اور جتنے
عضلات اور اعصاب ہیں سب جزئیات مادیہ ہیں پھر نفس کو اُن جزئیات
کا ادراک کیونکر ہو سکتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ قدرت یہ سب کام کر لیتی ہے جو نفس کی صفت ہے
تو ہم کہیں گے کہ قدرت ارادے کے تابع ہے اور ارادہ علم کے تابع
ہے جب تک کسی چیز کا علم نہ ہو اُس کا ارادہ نہیں ہو سکتا اور جب تک
ارادہ نہ ہو قدرت کچھ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ بغیر ارادے کے اگر قدرت

یہ کام کرے جب کہ آدمی میں ہر کام کی قدرت ہر وقت رہتی ہے تو
چاہیئے کہ ہر کام ہر وقت ہونے لگے جس سے دم بھر کی فرصت
ملنی مشکل ہو اور آدمی دیوانہ مشہور ہو جائے پھر ارادہ بغیر علم کے نہیں
ہوتا ورنہ طلب مجہول مطلق کی لازم آجائے گی جو محال ہے۔ اس سے
معلوم ہوا کہ تحریک عضلات وغیرہ مذکورمیں صرف قدرت بیکار ہے
حاصل یہ ہے کہ فعل کے وقت تحریک عضلات وغیرہ جو ہوتی ہے وہ
یا خود بخود ہوتی ہے یا ہمارے ارادے سے یا حق تعالیٰ کی خلق سے
چونکہ یہ مسلم ہے کہ کسی چیز کا وجود بغیر موجد کے نہیں ہو سکتا اس لئے خود بخود
تحریک عضلات ہونا باطل ہے اور تقریر سابق سے ثابت ہے کہ
حرکت ہمارے ارادے سے بھی نہیں ہوتی تو اب وہی تیسری صورت
باقی رہ گئی کہ حقتعالیٰ حرکت کو اعصاب وغیرہ میں پیدا کر دیتا ہے اور
یہ ہونا بھی چاہیئے اس لئے کہ حرکت ممکن ہے اور ممکن کے احد الجانبین
کو ترجیح دینا اور اس کو واجب بالغیر بنانا حق تعالیٰ ہی کا کام ہے۔
الحاصل فعل کے سلسلے میں ما جس سے وقوع فعل تک کوئی درجہ ایسا
نہیں کہ حق تعالیٰ کا مخلوق نہ ہو اس سے ثابت ہے کہ جس طرح آدمی کی
ذات وصفات مخلوق الٰہی ہیں۔ اسیطرح اُس کے جملہ حرکات وسکنات
اور افعال بھی مخلوق الٰہی ہیں۔ اس تقریر کے بعد امید ہے کہ معتزلہ کے

کل شبہات بشرط انصاف حل ہوجائیں گے۔ کیونکہ جب بدلائل عقلیہ ونقلیہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ کل افعال مخلوق الٰہی ہیں تو پھر کوئی شبہ قابل التفات نہوگا۔ جبریہ کہتے ہیں کہ بندے میں کسی طرح کی قدرت نہیں بلکہ وہ مثل جماد ہے۔ اور اشاعرہ کا مذہب ہے کہ قدرت تو ہے مگر موہوم جس کا اثر فعل میں نہیں ہوسکتا اور وہ فعل کے ساتھ ہی ہے مگر موہوم حنفیہ کا قول ہے کہ قدرت تو بتخلیق خالق موجود ہے لیکن وہ فعل میں اثر نہیں کرسکتی بلکہ فعل کو اللہ تعالیٰ ہی پیدا کرتا ہے معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ بندے میں قدرت موجود ہے اور ایسی قدرت سے بندہ اپنے افعال پیدا کرتا ہے اور وہ قدرت قبل صدور فعل بھی موجود ہے۔

اس مسئلے میں معتزلہ اور قدریہ نے صرف عقل ہی سے کام لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص جانتا ہے جس پر اس کا وجدان بھی گواہی دیتا ہے کہ اپنے میں کام کرنے کے وقت قدرت ہے۔ بلندی پر چڑھنے میں اور اوپر سے گرنے میں ہر عاقل فرق کرسکتا ہے کہ ایک اختیار سے ہے اور دوسرا بلا اختیار اس وجہ سے انھوں نے کہہ دیا کہ فعل بندے ہی کا مخلوق ہے۔ جبریہ نے دیکھا کہ نصوص قطعیہ تصریح کررہی ہیں کہ کل افعال مخلوق باریتعالیٰ ہیں کما قال اللہ تعالیٰ

واللہ خلقکم وما تعملون تو انھوں نے بندے کو مجبور محض اور
مثل جماد قرار دیدیا۔ اہل سنت نے دیکھا کہ اسمیں جزا و سزا کا معاملہ درہم
و برہم ہوئے جاتا ہے اس لئے انھوں نے کسب پر جزا و سزا کو مبنی
کیا جس پر آیۂ شریفہ۔ لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت دال ہے۔ مقصود
ان حضرات کا یہ ہے کہ راہ توسط اختیار کیا جائے یعنی افعال مخلوق الٰہی
ہوں اور جزا و سزا کسب سے متعلق ہو۔ حضرات صوفیہ کا مسلک
بھی اس مسئلے میں ظاہرا جبریہ کا سا معلوم ہوتا ہے چنانچہ ان کی تصریحات
سے یہ امر ظاہر ہے۔ مگر چونکہ ان کا مسلک ہے کہ حتی الامکان آیات میں
تاویل نہ کریں۔ اس لئے بلحاظ اُن آیات کے جن میں عمل کی تاکید ہے
اعلیٰ درجے کا عمل میں اہتمام کیا اور اسقدر عمل میں مشغول ہوئے کہ معتزلہ
اور قدریہ باوجود اس اعتقاد کے جو مقتضی کمال اہتمام عمل ہے اس قدر
عمل نہیں کر سکتے چنانچہ یہ بات اُن کے حالات اور تذکروں سے
ظاہر ہے اور اعتقاد میں وہ بالکل جبریہ کا سا اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ ایک
حیثیت سے اُن پر بھی فائق ہیں اُن کے مسلک پر بھی بندے
میں کسی قسم کی قدرت نہیں بلکہ ہر طرح کی قدرت خدائے تعالیٰ ہی کے
لئے مسلم ہے اور مختار وہی ہے بندے کے اختیار کو کوئی دخل
چنانچہ ارشاد ہے وربک یخلق ما یشاء ویختار ما کان لھم الخیرۃ

سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون۔

یہ تو باتفاق اہل سنت وجماعت ثابت ہے کہ قدرت اور افعال دونوں حق تعالیٰ ہی کے مخلوق ہیں۔ اب رہ گیا کسب یعنی قدرت کو صرف کرنا اس کو بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو آخر وہ بھی فعل قلبی ہی مثل حدیث نفس و توکل و ایمان وغیرہ اور وہ واللہ خلقکم وما تعملون میں داخل ہے۔ اس تقدیر پر کوئی فعل بندہ کا مخلوق واختیاری نہیں ہو سکتا بلکہ بندہ مع جمیع افعال مخلوق الٰہی ہے اس مقام میں اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر بندے کو کچھ اختیار نہ ہو اور ارادہ وغیرہ بھی خدا ہی پیدا کرے تو جبر اور خلاف عدل لازم آئے گا اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اعتراض چنداں قابل التفات نہیں۔ اس لئے جو لوگ مادرزاد اندھے، بہرے گنگے، اپاہچ، اور ضعیف الخلقت پیدا ہوتے ہیں اور ہمیشہ بیمار رہتے ہیں جب ہمجنسوں کو نعمتوں اور صحت میں دیکھتے ہوں گے تو اُن کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی کیا اس کو عذاب نہ سمجھتے ہوں گے اگر بغیر فعل کے عذاب خلاف عدل ہے تو اس خلق کو بھی خلاف عدل کہنا چاہیئے حالانکہ کوئی اس کا قائل نہیں ہے۔

رہا یہ کہ یہ عذاب اس عالم میں افعال سے متعلق نہیں اور جو عذاب اُس عالم میں ہوگا وہ افعال سے متعلق ہے سو یہ بحث دوسری ہے

یہاں کلام صرف عدل میں ہے۔ ایک بندے کو بلا سبب عذاب میں رکھنا اور دوسرے کو نعمتیں دینا اُن کے عقیدے پر خلاف انصاف ہی

الغرض حق تعالیٰ نے جسطرح بعض بندوں کو اقسام کی نعمتیں عطا فرمائیں اسیطرح بعضوں کو توفیق بھی عطا فرمائی یعنی خیالات بھی اُن میں اچھے پیدا کر دئے اور اس کے موافق ان میں افعال بھی پیدا کر دئے جس سے وہ قابل تقرب ہو جائیں اور کسی دوسرے کو اس قابل نہ بنایا تو خلاف عدل کیونکر ہوگا۔ مالک مختار جسکو جو چاہا دیا کوئی اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا اور نہ پوچھنا جائز ہوگا کہ اپنی ملک میں یہ کیوں کیا۔ قال اللہ تعالیٰ لا یسأل عما یفعل وھم یسئلون اسی وجہ سے صاف ارشاد فرمایا ولقد ذرأنا لجھنم کثیرا من الجن والانس جب جہنم ہی کے واسطے بہت سے لوگوں کو پیدا فرمایا تو ان کے کسب کا اختیار ہی ہونا کس کام پڑآیگا۔ اس لئے کہ جو شخص قبل عمل بلکہ قبل پیدائش دوزخی ٹھیر جائے تو وہ اختیار سے کیا نفع اٹھا سکتا ہے۔

حکمت جدیدہ والوں کو اس کا یقین ہے کہ آدمی جس چیز کو دیکھتا ہی الٹی دیکھتا ہے۔ چنانچہ آدمی کا سر نیچے اور پاؤں اوپر نظر آتا ہے مگر قوت لامسہ اور قرائن سے مدد لیکر سر اوپر اور پاؤں نیچے سمجھنے کی عادت ہوگئی۔ یہ خیال ایسا متمکن ہے کہ تمام عالم کا مشاہدہ ایکطرف ہے

اور وہ ایک طرف اس خیال کا اُن کو ایسا وثوق ہے کہ تعلیم و تعلم
میں اس مسئلہ کو داخل کر دیا۔ اسی طرح ہنود کے عقائد اپنے دیوتاؤں
کے ساتھ ایسے ہیں کہ کوئی عاقل اُن کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ علی ہذا
دوسرے اقوام اپنے اپنے عقائد مخصوصہ کی تصدیق پوری پوری کرتے
ہیں اور کچھ خیال نہیں کرتے کہ وہ خلاف مشاہدہ اور بداہت عقل ہیں
مگر افسوس ہے کہ اہل اسلام باوجود دعوائے اسلام کے حق تعالیٰ کے
قول کی تصدیق نہیں کرتے اور اپنی عقل کے مطابق بنانے کیلئے
آیات قرآنی میں تاویلیں کرتے ہیں۔

چونکہ معتزلہ وغیرہ کا استدلال وجدان قدرت پر ہے اس لئے
اس کا بھی حال کچھ معلوم کر لینا چاہئے۔

وجدان اس علم کا نام ہے جو آدمی اپنے میں پاتا ہے، چونکہ حواس
کو بقول حکما شعور نہیں اس لئے اُن کو وجدان بھی نہ ہوگا۔ بلکہ بواسطہ
حواس نفس کو ادراک اور اس کا وجدان ہوتا ہے مثلاً کوئی عضو جلے
یا سرد ہو تو بواسطہ قوت لامسہ نفس کو گرمی اور سردی کا احساس اور
وجدان ہوتا ہے اسیطرح جملہ حواس اور قوائے متخیلہ و واہمہ وغیرہ
نفس کے ادراک کیلئے آلات ہیں اور نفس کو ان تمام ادراکات
کا وجدان ہے جیسے خوشی اور غمی اور بھوک اور پیاس وغیرہ کیفیات کا

وجدان ہے چونکہ سلسلۂ فعل ہی میں قدرت بھی قائم کی گئی ہے
اس لئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ جس طرح ہمکو ما جس سے عزم تک جمیع مدارج کا
وجدان ہے ایسا ہی قدرت کا بھی وجدان ہے یا نہیں جب کسی
کام کا خطور ہم میں ہوتا ہے کہ کوئی نئی بات ہم میں پیدا ہو گئی ہے
جو پہلے نہ تھی یہی وجدان ما جس ہے اسی طرح عزم تک نفس کو ہر درجے
کا وجدان ہوتا ہے اور ہر مرتبہ کے مناسب آثار نفس میں بلکہ خارج
میں نمایاں ہوتے ہیں۔ بخلاف قدرت کے اس لئے کہ اس سلسلے
میں کوئی نئی چیز ایسی پیدا نہیں ہوتی جس کا نام قدرت رکھا جائے
اگر کہا جائے کہ ہر شخص کو کام کرنے کیوقت اس امر کا وجدان ہوتا ہے
کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ اسوجہ سے اُسی کام کا ارادہ کرے گا جس کے
کر سکنے کا وجدان ہوتا ہے۔ اسی کا نام وجدان قدرت ہے۔ تو
جواب اسکا یہ ہے کہ یہ قدرت کا وجدان نہیں بلکہ اُس کام کے علم کا
وجدان ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے دیوار کو دیکھنے سے
ایک وجدانی کیفیت آدمی اپنے میں پاتا ہے جسکو دیوار کا وجدان
نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ اُس کے علم کا وجدان ہے اس لئے کہ دیوار کا
علم حصولی ہے اور وجدان علم حضوری میں ہوا کرتا ہے اور علم کا وجدان
اسوجہ سے کیا جاتا ہے کہ وہ نفس کی کیفیت ہے جس کا علم حضوری

ہوتا ہے۔ اسی طرح کام کرنے کا علم جو قبل فعل ہوتا ہے وہ بھی علم
حصولی ہے اس لیئے کہ ابھی کام کا وجود ہی نہیں اور ہوگا بھی تو جوارح
سے ہوگا۔ پھر اس کا علم حضوری کیونکر ہوگا البتہ اس کے علم کا علم حضوری
ہے فعل کا علم ایسا ہے جیسے طبیب حاذق کو بعد ملاحظہ قرائن و اسباب
اس امر کا علم ہوتا ہے کہ بیمار مرجائے گا یا صحت پائیگا اور وہ اس کو امر
وجدانی سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا وجدان اس پر گواہی دیتا ہے
اسی طرح ہر شخص کا وجدان قرائن کی وجہ سے گواہی دیتا ہے کہ ہم
یہ کام کر سکتے ہیں۔ مثلاً جو شخص گھوڑے کی سواری نہ جانے اور لوگونکو
کرتے دیکھے تو یہ کہیگا کہ میں سواری نہیں کر سکتا اور جب کئی بار سوار
ہوا اور نہ گرے تو اس قرینے سے کہیگا کہ میں سواری کر سکتا ہوں
اگرچہ بظاہر وہ اپنے وجدان کی خبر دیتا ہے کہ مجھ میں سواری کی قدرت
ہے مگر دراصل وہ علم استدلالی ہے جو بنظر قرائن حاصل ہوا ہے
اسی طرح بیمار جب چلتا ہے اور بہ سبب ضعف کے چل نہ سکے تو اس
پر قیاس کرکے خبر دیتا ہے کہ مجھ میں چلنے کی قدرت نہیں پھر جب
چند بار چلے اور نہ گرے تو یہ کہتا ہے کہ میں اپنے میں قدرت چلنے
کی پاتا ہوں۔ اگرچہ یہ بھی وجدان ہی کی خبر دیتا ہے مگر وہ وجدان سے
متعلق نہیں بلکہ قیاس اور علم استدلالی ہے اور یہ وجدان بعینہ

ایسا ہے جیسے طبیب کا وجدان بیمار کی صحت یا موت پر ہوتا ہے بات یہ ہے کہ جب قرائن سے کسی کام کے کرنے کا علم ہوجاتا ہے تو اُس علم کا وجدان بھی ہوجاتا ہے اور آدمی اسکو سمجھتا ہے کہ وہ قدرت کا وجدان ہے حالانکہ وہ وقوع فعل کے علم کا وجدان ہے اسی وجہ سے اس میں خطا بھی ہوتی ہے اور وہ علم خلاف واقع ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً بسا وقت آدمی دعوی کرتا ہے کہ میں یہ کام کرسکتا ہوں اوراس پر اُس کو اس قدر وثوق ہوتا ہے کہ شرط تک باندھ لیتا ہے پھر باوجود اس کے نہیں کرسکتا۔ اگر اس کو شرط باندھنے کے وقت اس قدرت کا وجدان ہوتا جو اس کام کے لئے کافی ہے تو وہ کام ضرور کرسکتا۔ پھر جب نہ کرسکا تو معلوم ہوا کہ اس کام کی قدرت کا وجدان ہی نہ تھا۔

اگر کہا جائے کہ بھوک کے وقت ایک ایسی حالت کا وجدان ہوتا ہے جس سے آدمی سمجھتا ہے کہ میں کام نہیں کرسکتا۔ پھر کھانا کھانیکے بعد ایسی حالت پیدا ہوتی ہے کہ اُس سے اپنے میں کام کرنے کی قوت پاتا ہے اور یہ وجدان ایسا ہے کہ کوئی اسکا انکار نہیں کرسکتا ہم اسی قوت کا نام قدرت رکھ سکتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ بعد کھانا کھانے کے جو حالت طراوت وتازگی پیدا ہوتی ہے وہ نباتات

میں بھی ہوتی ہے۔ دیکھ لیجئے چھوٹے درختوں کو سینچنے میں دیر ہو تو پژمردہ اور مضمحل ہو جاتے ہیں جب ان میں پانی سرایت کرتا ہے تو فوراً ان میں تازگی شروع ہو جاتی ہے اور کم زور مرجھائے ہوئے پتوں میں طاقت آجاتی ہے جس سے وہ کھڑے ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ درختوں میں قدرت ہے اسی سے معلوم ہوا کہ طراوت اور تازگی کا نام قدرت نہیں ہو سکتا۔

بات یہ کہ جب حق تعالی کو اعضا سے کام لینا منظور ہوتا ہے تو ان میں مناسب رطوبت ورنہ یبوست مفرطہ پیدا فرما دیتا ہے مثلاً جب نسیان پیدا کرنا منظور رہو تو خواہ بوجہ پیری یا اور کسی سبب سے دماغ میں یبوست مفرط پیدا فرما دیتا ہے جس سے نفس ناطقہ نسیان پر مجبور ہوتا ہے اور قوت حافظہ پیدا کرنا ہو تو رطوبت مناسبہ پیدا فرما دیتا ہے اسی طرح تمام اعضا میں رطوبت مناسبہ پیدا ہوتی ہے اس کے بعد بحسب وجود شرائط فعل پیدا ہوتا ہے مگر چونکہ اس کی عادت ہوگئی ہے اس لئے آدمی اسی وجدان طراوت کو قدرت سمجھتا ہے حالانکہ فعل کی تکمیل جس میں قدرت موثر سمجھی جاتی ہے صرف رطوبت اعضا سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں کشش اعصاب و عضلات کو بھی دخل تام ہے اور اسکا حال ابھی معلوم ہوا کہ نفس اس میں لاعلم محض ہے

بادی الرائے میں جو وجدان قدرت معلوم ہوتا ہے وہ قدرت کا وجدان نہیں بلکہ اس کا اشتباہ ہے کیونکہ وجدان کے سمجھنے میں اکثر غلطی ہوتی ہے جسکی کئی نظیریں ہیں۔

۱۔ جھولا جھولنے اور چکر پھرنے کے بعد وجدان ہوتا ہے کہ تمام چیزیں پھر رہی ہیں حالانکہ یہ وجدان غلط ہے۔

۲۔ ریل کے بازو سے دوسری ریل گذرے تو گذرنے والونکو وجدان ہوتا ہے کہ ہم ساکن ہیں اور دوسری ریل متحرک ہے۔

۳۔ بہت سے لوگ اپنے میں قدرت پاکر بصرف زر کثیر نکاح کرتے ہیں پھر مقصود میں کامیاب نہیں ہوتے حالانکہ قوت کا فیہ کا وجدان جو تھا غلط ثابت ہوا۔

۴۔ افیمی کو افیم نہ ملنے سے جو ردی حالت پیدا ہوتی ہے اسوقت کوئی چیز مشابہ افیون کے دیجاتے گو اس میں نشہ نہ ہو تو وہ افیون کا نشہ اپنے میں پاتا ہے حالانکہ یہ وجدان بھی غلط ہے اس لئے کہ وہ چیز نشہ کی نہ تھی۔

جب وجدان میں غلطی ہونا مسلم ہے تو بالفرض اگر ہم قوت کے وجدانی مان بھی لیں تو ضرور نہیں کہ منشا اس کا واقعی ہو بلکہ جائز ہے کہ جس چیز کا وجدان ہو رہا ہے یعنی قوت ہی سرے سے معدوم ہو جیسے افیونی کی

مثال مذکورہ سے ظاہر ہے۔

الحاصل۔ وجدانِ قدرت سے قدرت کا وجود اور فعل کا اختیاری ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اب یہاں یہ معلوم کرنا ضرور ہے کہ جب دلائلِ عقلیہ اور نقلیہ سے ثابت ہے کہ بندے کی قدرت و اختیار کو اس کے فعل میں کوئی دخل نہیں تو کسب کے کیا معنی ہوں گے جو لہا ما کسبت۔ میں ارشاد ہے اور جزا و سزا کس چیز پر مبنی ہے۔

اصل کسب کے معنی جمع کے ہیں اور استعمال اسکا طلب مال ورزق وغیرہ میں آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کسبت المال والرزق مطلب یہ ہوا کہ کسی موجود چیز کو حاصل اور جمع کرنے کا نام کسب ہے اس صورت میں افعال کا کسب ایسا ہو گا جیسے مال کا کسب یعنی جیسے مال کے وجودِ ذاتی میں ہم کو کچھ دخل نہیں ویسے ہی افعال کے وجود میں بھی ہمیں کچھ دخل نہیں بلکہ ان کو صرف اپنے میں جمع کر لینے کا نام کسب ہے جیسا کہ مال کے جمع کرنے میں ہوتا ہے ہاں فرق اتنا ہے کہ مال کے حاصل کرنے میں مال پہلے سے ہوتا ہے اور افعال حاصل کرنے کیوقت موجود ہوتے ہیں اور بندہ ان افعال کا ظرف ہوتا ہے اگرچہ اس اعتبار سے بندہ افعال قبیحہ کے ارتکاب پر معذور سمجھا جانا چاہیئے مگر جسطرح ظرف جب محلِ نجاست ہو جاتا ہے تو اس قابل

نہیں رہ سکتا کہ اسکو دستر خوان پر جگہ ملے بلکہ اس کی جگہ مزبلہ یا پاخانہ ہوتی ہے جہاں نجاست کا مقام ہے گو ظرف کے فعل کو وجود نجاست میں کوئی دخل نہیں اسیطرح بندے کو وجود معاصی میں دخل نہیں لیکن جب محل نجاست معیوب بن جائے تو قابل تقرب نہیں رہتا جبتک گناہوں سے پاک وصاف نہ ہو جائے اگرچہ یہ دونوں ظرف ہیں لیکن بہت بڑا فرق یہ ہے کہ آدمی ایسا ظرف ہے کہ اس کو سمجھ بھی ہے اور سمجھ ایسی چیز ہے کہ مدح و ذم کا مدار اسی پر ہے۔ اسی وجہ سے لڑکے اور سکران اور دیوانے کے افعال قابل مواخذہ نہیں سمجھے جا سکتے

قاتل شرعاً بھی قابل مواخذہ ہے باوجودیکہ نص قطعی سے ثابت ہے کہ مقتول کی عمر میں قاتل کے فعل سے کچھ کمی نہیں ہوتی مگر چونکہ اس کی دانست اور زعم میں مار ڈالنا ہوتا ہے اس لئے وہ قابل مواخذہ ٹھیرا۔

اگر کوئی شخص اشتباہ قبلہ کے وقت تحرّی کر کے نماز پڑھ لے تو نماز اس کی صحیح ہو جائے گی گو اس نے خلاف جانب قبلہ نماز پڑھی ہو کیونکہ اس کی دانست میں قبلہ وہی ہے۔

قانون سرکاری باب مستثنیات عامہ میں مصرح ہے کہ نیک نیتی سے کوئی فعل ضرر رساں صادر ہو تو جرم نہیں کیونکہ اس کی دانست میں ضرر پہنچانا

مقصود نہیں۔

بہت کم بیمار مرتے ہوں گے جو کسی طبیب کے زیر علاج نہ ہوں یا علاج میں بدعنوانی نہ ہوتی ہو مگر چونکہ اس کی دانست میں ضرر رسانی نہیں ہوتی اس لئے ورثہ بھی اس کو قابل مواخذہ نہیں سمجھتے۔

الغرض۔ صدہا مثالیں مل سکتی ہیں کہ دانست گو خلاف واقع ہو مگر مواخذہ اسی سے متعلق ہے اور جو کام آدمی سمجھکر کرتا ہے اس کے آثار اسکی طبیعت میں موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی دوست کو دشمن سمجھکر مار دے تو مارنے کیوقت جو کیفیت دشمن پر غالب ہونے کیوقت ہوتی ہے یعنی تعلّی وغیرہ وہ سب اپنے میں پائیگا اور اس پر افتخار کرے گا۔ پھر جب ظاہر ہو جائے کہ وہ دوست تھا تو اس فعل پر ندامت ہوگی یہ دونوں آثار صرف اس دانست وعلم سے متعلق ہیں جو دونوں وقت اس میں پائے گئے۔ اب دیکھئے کہ ہر آدمی کی دانست میں یہ بات کسقدر راسخ اور مستحکم ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں ہم اپنے اختیار سے کرتے ہیں اور کسی کام کے وقت یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ فعل حق تعالےٰ ہم میں پیدا کر رہا ہے گو یہ دانست خلاف واقع ہو۔ مگر ثواب وعقاب اسی سے متعلق ہے۔ پھر اگر کوئی اس پر ایمان بھی لایا تو اس کی خود حالت قلبی اس کی تکذیب کرتی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ بہت کم لوگ

ایسے نکلیں گے کہ کوئی شخص ان پر تعدی کرے اور ان کی حالت قلبی نہ بدلے۔ حالانکہ مقتضا اس ایمان کا یہ تھا کہ جو کچھ ایذا کسی سے پہنچے وہ حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھی جائے اور تعدی کرنیوالے کا خیال بھی نہ ہو اگرچہ عقلاً اور نقلاً یہ مسئلہ مدلل ہے کہ کل افعال مخلوقِ الٰہی ہیں مگر ابتک ہمیشہ جو عادت ہوگئی ہے کہ ارادے کیساتھ فعل موجود ہوتا ہے تو اُس عادت کیوجہ سے جو بجائے خود طبیعت ہو جاتی ہے وجدان گواہی دیتا ہے کہ ہم میں قدرت ہے اور اعتقاد مغلوب ہوجاتا ہے جیسے قوت واہمہ سے عقل مغلوب ہوجاتی ہے مثلاً بلندی پر کم عرض جگہ میں چلنا مشکل ہوتا ہے۔ حالانکہ تجربہ مشاہدہ اور عقل گواہی دیتی ہیں کہ اُس سے کم عرض جگہ میں آدمی ہمیشہ چلتا ہے۔ پھر جب فعل کے وقت وجدانِ قوت ایمان پر غالب ہوجائے تو اُس حالت میں ایمان سابق کا وجود کالعدم ہے جسطرح قوت واہمہ کے وقت عقل و تجربہ کا وجود بیکار ہے۔

اس دانست و وجدان کے اعتبار سے مواخذہ خلاف عدل و انصاف ثابت نہیں ہو سکتا جسطرح قتل شرعاً قابل مواخذہ ہے اور عرفاً و قانوناً دشنام دہی جرم ہے۔ حالانکہ جس فعل کی وہ تصریح کرتا ہے نہ اس کا وقوع زمانۂ ماضی میں ہوتا ہے نہ استقبال میں بلکہ صرف اس کے اس خیال قبیح پر قابل مواخذہ سمجھا جاتا ہے اگر کہا جائے

کہ دشنام دہی خود فعل ہے جس کا وجود جوارح یعنی زبان سے متعلق ہے
یہ جرم فعل کا ہوگا نہ خیال کا۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ اگر قابل مواخذہ
ہے تو وہ فعل ہے جس پر الفاظ دلالت کرتے ہیں اور الفاظ اخبار ہوں
یا انشاء کسی طرح قابل مواخذہ نہیں ہیں جب تک کہ وہ کسی خیال سے
ظاہر نہ ہوئے ہوں اسی وجہ سے اگر کسی خاص شخص کے نام سے
گالی دیوار پر لکھی ہو تو اس کا لکھنے والا مجرم اور قابل مواخذہ ہوگا۔ اگر یہ
ثابت ہو جائے کہ گالی دینے والا نشہ کی حالت میں تھا تو معذور سمجھا جاتا
ہے حالانکہ زبان کا فعل وہاں بھی موجود ہے مگر چونکہ وہ بیخودی اس کی
تسلیم کی جاتی ہے اس لئے اس کا فعل غالباً قابل مواخذہ نہیں سمجھا جاتا
اس سے ثابت ہے کہ عرفاً و عقلاً بھی قابل مواخذہ دانست ہی ہے
گو خلاف واقع ہو۔

برقی روشنی

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

ہم جن چیزوں کو روزمرہ دیکھ رہے ہیں اگر غور اور تدبّر کی نگاہ سے دیکھیں تو بہت ساری لاینحل عقدے حل ہو سکتے ہیں دیکھئے آجکل مشاہدہ کر رہے ہیں کہ یورپ کے عقلمندوں نے برقی روشنی ایک عجیب چیز ایجاد کی ہے جس کے کرشمے ایک عالم کو حیران کر رہے ہیں کیا یہ بات عالم کو محو حیرت کرنے کیلئے کافی نہیں ہے کہ صدہا اور ہزارہا چراغ ایک ادنیٰ حرکت سے روشن ہو جاتے ہیں اور پھر ایسی صنعت سے کہ کوئی سفید ہے کوئی سبز اور کہیں سرخ ہے تو کہیں زرد بیسیوں رنگ کے چراغ آن واحد میں جلوہ گر ہوجاتے ہیں اور ہر ایک چراغ دوسرے سے کامل ممتاز نظر آرہا ہے صرف یہی نہیں بلکہ کہیں پھول کی شکل ہے تو کہیں پتے وغیرہ کی ایسی صنعت اور جدت طرازیوں کو دیکھتے ہوئے کیا بعید ہے کہ آئندہ کسی زمانہ میں حیوانات اور انسانوں کی شکلیں بھی بنائی جائیں اور وہ سب ممتاز حیثیت میں نور کے پتلے بنکر اپنے

دیکھنے والوں کو محو تماشا بنا دیں۔

اس برقی روشنی کا ایک خاص منبع ہوتا ہے جس پر اس عالم نورانی کا مدار ہے وہاں ایک ایسا بٹن بنا ہوتا ہے جسکو ایک ذرہ سی حرکت دینے سے تیرہ و تار مقامات بقعۂ نور بنجاتے ہیں اور ایسا دلچسپ سماں نظر آتا ہے کہ دیکھنے والے اُس کی دلچسپی میں محو حیرت ہو جاتے ہیں اگر پہلے پہل کسی دیہاتی شخص کے روبرو جس نے کبھی اپنی عمر میں برقی روشنی نہیں دیکھی ہو اُس کو یہ سماں دکھلایا جائے تو جس قدر اُس کو حیرانی ہوگی اُسکا اندازہ نہیں ہو سکتا اگر یہی کام ہر روز اُس کے روبرو کیا جائے اور وہ اس روشنی کا عادی ہو جائے تو اس کی ابتدائی کیفیت باقی نہ رہے گی اب اگر اُس سے پوچھا جائے کہ بھائی یہ عمدہ عمدہ صنعتیں جو تم ہر روز دیکھ رہے ہو ان کی کیا حقیقت ہے اور اُنکا بنانیوالا کسدرجہ کا صناع ہے تو بے ساختہ اُس کے مونھ سے یہی نکلیگا کہ ہماری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی اور نہ ہمیں اس کے سمجھنے کی کوئی ضرورت ہے یہ تو ایک عامی اور سادہ لوح شخص کی حالت تھی اگر کوئی عقلمند شخص ہو تو وہ اسی فکر میں لگا رہے گا کہ آخر اُس کی لِم کیا ہے اور دفعتاً اسقدر چراغ کیونکر روشن ہو جاتے ہیں بالآخر ایسے لوگوں کی جد و جہد کا ثمرہ ان کو مل ہی جاتا ہے اور وہ اپنے اپنے

حوصلے کے موافق کچھ سمجھ بھی لیتے ہیں اب عقلمندوں کو اسی پر قیاس
کرنا چاہیئے کہ عالم پہلے تیرہ و تار تھا بلکہ یوں کہیئے کہ عالم کچھ بھی نہ تھا ہر طرف
ہر طرف عدم کی تاریکی ہی تاریکی تھی پھر حق تعالی نے ایک ادنیٰ حرکتِ
"کن" سے تمام عالم کو روشنی وجود سے منور کر دیا گویا اس تاریکی
میں قسم قسم کے چراغ روشن ہو گئے کیونکہ موجود بھی ایک چراغ ہے
جس کے نور وجود ظاہر ہو رہا ہے اور چراغ جس طرح اس تاریکی میں
ممتاز ہو کر نظر آتا ہے اسی طرح ہر موجود ممتاز ہو کر نظر آرہا ہے ادنیٰ
تامل سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ چراغ میں بھی نورِ وجود نہ ہو تو
بالکل نظر نہ آئیگا اس لیئے کہ وہی چراغ جبتک عدم میں تھا نمایاں نہ تھا صرف
وجود کی وجہ سے نمایاں ہو گیا۔ اور قبل وجود اس کا کہیں پتا نہ تھا البتہ
روشن کرنیوالے کے علم میں اسقدر ضرور تھا کہ اس مقام میں فلاں قسم کا
چراغ ہو اور اس مقام میں فلاں قسم کا اسی طرح حق تعالی کے علم میں
ہر چیز کا وجود تھا اس وجود علمی کے سوا ان چراغوں میں یہ بات بھی
ضرور تھی کہ منور کرنیوالے نے ہر ایک چراغ کو ایک ایک مقام میں معین
کر دیا تھا کہ فلاں مقام میں فلاں قسم کا چراغ ہو اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے
ہیں کہ ہر ایک چراغ کیلئے ایک ذات تھی جس کا وجود بجز روشنی کے
خارج میں آگیا پس اس ذات معدومہ کو اس چراغ کی عین ثابتہ کہہ سکتے ہیں

کیونکہ ہنوز اس کا وجود نہیں ہوا بلکہ صرف اُسکو ایک قسم کا ثبوت ہے
جو وجود کے پہلے کا درجہ ہے اسی طرح موجودات عالم کے اعیان ثابتہ
پہلے سے تھیں جو نور وجود کے ساتھ ہی باہم ممتاز ہو کر وجود میں آگئیں
یہ امر مسلم ہے کہ آدمی کسی چیز کو موجود نہیں کر سکتا یعنی کسی معدوم کو وجود
میں لانے پر ہرگز قادر نہیں ہے صرف اتنا ہی کر سکتا ہے کہ موجودہ اشیاء
میں ایک خاص قسم کی ترکیب دیکر ایک چیز بنا دیتا ہے مثلاً مٹی پتھر
لکڑی وغیرہ کو ایک خاص قسم کی ترکیب دیکر گھر بنا لیا اگر پیشتر سے گھر
کے اجزا موجود نہ ہوتے تو انسان ہرگز گھر نہ بنا سکتا اسی طرح برق
جو ایک موجود چیز ہے اُس میں تصرف کر کے روشن کر دیتا ہے مطلب
یہ ہے کہ وہ نہ تو برق کی ذات کو وجود میں لا سکتا ہے اور نہ روشنی کو
بلکہ صرف اپنی تدبیر سے موجودہ برقی قوت کو یا یوں کہیے کہ مادۂ برق کو
جمع کر دیتا ہے اور ایک ایسی خاص قسم کی حرکت دیتا ہے جس سے
اُس میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے اور یہ مادۂ برق یا اصلی قوت جس میں
انسان نے تصرف کر کے مشتعل کر دیا ہے حق تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے
اُس کی ایجاد انسان کی قدرت سے بالکل خارج ہے اسی طرح انسان کا
ہر ایک عمل صرف تصرف اور اشتعال ہے اشیاء موجودہ میں آدمی
جن اعیان ثابتہ کو موجود کرتا ہے وہ موجودات کی ایک خاص قسم کی حالت

ہوتی ہے مثلاً مکان کی عین ثابتہ لکڑی پتھر وغیرہ کی ایک خاص ہیئت
تھی جس کا نقشہ بنانیوالے نے اپنے ذہن میں ٹھیرایا تھا پھر اُن موجودہ
اشیاء میں تصرف کرکے اور ایک قسم کی ترکیب دیکر مکان کی عین ثابتہ کو
موجود کر دیا اگرچہ مکان کا یہ وجود خارجی پہلے نہ تھا مگر وہ اشیاء جنکو یہ
ہیئت عارض ہوئی ہے پہلے سے موجود تھیں بخلاف خداوند تعالے
کے کہ اُن اعیان ثابتہ کو وجود دیتا ہے جن کا کوئی مادہ خارج میں نہیں ہوتا
ایسا وجود دینا خاص حق تعالیٰ ہی کا کام ہے اگر خداوند تعالے کی تخلیق
کیلئے بھی پیشتر مادہ کی ضرورت ہو تو وہ بھی مثل انسان کے محتاجِ مادہ
ہوجائیگا کہ جب تک مادہ نہ ہو کچھ پیدا ہی نہ کرسکے حالانکہ خدا کی شان سے
یہ بعید ہے کہ وہ کسی چیز کا محتاج ہو اور اگر مادۂ عالم پہلے ہی سے موجود ہو
اور کسی کا بنایا ہوا نہ ہو تو اس کو ہی خدا کہنا پڑے گا کیونکہ خدا کے معنی
ہی یہ ہیں کہ خود بخود موجود ہو گیا ہو کسی نے اُسکو پیدا نہ کیا ہو جیساکہ خدا کی
لفظی ترکیب بھی یہی بتارہی ہے کہ خدا کی اصل خود آ تھی اب اگر یہ مان لیا جائے
کہ مادہ قدیم ہے اور وہی خدا ہے تو پھر ذات باری تعالیٰ کے ماننے
کی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ عالم کے لئے ایک خدا کافی ہے چنانچہ
مادہ پرست دہریہ یہی کہتے ہیں کہ تخلیق عالم کیلئے مادہ کافی ہے خدا کی
کوئی ضرورت نہیں۔ یہ خیال اُن کو اس لئے پیدا ہوا کہ ہم جس چیز کو

بناتے ہیں اُس کا کچھ نہ کچھ مادہ ضرور ہوتا ہے ایک ہانڈی بنائی جاتی ہے تو اُس کے لیے بیشتر مٹی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک صندوق بنایا جائے تو پہلے لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے غرض ہماری مصنوعات میں کوئی چیز ایسی نہیں مل سکتی جس کا کچھ نہ کچھ مادہ ہو جب ہمیں کچھ بنانیکی ضرورت ہوتی ہے تو پہلے مادہ کو فراہم کرنیکا خیال ہوتا ہے اس سے اُنھوں نے یہ خیال گھڑ لیا کہ جو چیز پیدا ہوگی اُس کا کچھ نہ کچھ مادہ ضرور ہوگا مگر افسوس اُنھیں یہ نہ سوجھا کہ آخر مادہ بھی ایک چیز ہے اُسکا کیا مادہ ہوگا۔ اگر اس خیال کو وہ مستحکم کرتے اور خوب غور کرتے تو ضرور اُن کو ماننا پڑتا کہ ہر چیز کو مادہ کی ضرورت نہیں ہے صرف مادیات محتاج مادہ ہیں بہرحال اپنی مصنوعات پر قیاس کرکے یہ حکم لگا دینا کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو بغیر مادہ کے بنی ہو اس لئے عالم کا ایک مادۂ اولی ہونا ضرور چاہیئے ایک بے اصل حکم اور قیاس مع الفارق ہے اگر آپ اُن سے یہ پوچھیں کہ وہ مادہ کیا چیز ہے اور اسکی حقیقت کیا ہے تو نہ اسکی حقیقت بتلا سکتے ہیں نہ کوئی چیز دکھا سکتے ہیں بجز اس کے کہ ایک فرض کردہ خیالی چیز کی تعریف کر دیں اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک جوہر بسیط ہے جو اپنے ظہور میں صورت کا محتاج ہے اور کسی کا قول ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے سخت اجزا ہیں جو ٹوٹتے پھوٹتے نہیں۔

اب یہاں غور کرنا چاہیئے کہ ابتدائی تقریر ایسی چیز سے شروع ہوئی تھی جو محسوس ہے مثلاً ہانڈی کیلئے مٹی اور صندوق کے لئے لکڑی اور انتہا اُس چیز پر ہوئی جو کسی طرح محسوس ہی نہیں ہو سکتی اور خود مادئین اس کے محسوس کرانے سے عاجز ہیں اور پھر باہم ان میں اس کے متعلق ایسی نزاع واقع ہوئی ہے کہ کوئی فرقہ اپنے دعوی کو ثابت نہ کر سکا جس سے دوسرا فرقہ ساکت ہو جائے باوجود اس کے ہمارے بعض احباب اُن کے اقوال کی ایسی تصدیق کرتے ہیں کہ گویا ایمان لاتے ہیں اور ان خیالی باتوں کے مقابلہ میں خدا ورسول کے فرمان واجب الاذعان کو کہ حق تعالیٰ جس چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے اُس کو کن سے مخاطب کرتا ہے اور وہ چیز فوراً بلا تاخیر وجود میں آجاتی ہے ہرگز پروا نہیں کرتے اور ان مادئین کی تقلید سے ایک ایسی چیز کے قائل ہو رہے ہیں جس کو نہ دیکھا ہے اور نہ دکھا سکتے ہیں جب مسلمان کہلاتے ہیں تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ مادئین کی اُن باتوں کو جن کا ثبوت خود اُن کے نزدیک نہیں ہے نہ مانتے اور خدا کی بات کو جس کے صادق القول ہونے پر بوجہ مسلمان کہلانے کے ایمان رکھنا چاہیئے۔ مان لیتے مگر افسوس ہے کہ خدا تعالیٰ کی اُن کے نزدیک اتنی بھی وقعت نہیں کہ اُس کی بات کو ان بے اصل مخدوش اور خیالی باتوں پر

ترجیح دیں۔

نیچریہ یعنی فرقہ دہریہ پر مسئلہ مادہ کا اسقدر اثر ہوا کہ اس مسئلہ کی ابتدا جہاں سے ہوئی تھی اس کو وہ سرے سے بھول ہی گئے اسلئے کہ ابتدا، تو یوں ہوئی تھی کہ اگر ہم کسی چیز کو بنانا چاہتے ہیں تو پہلے مادہ کی ہمیں ضرورت پڑتی ہے جب مادہ ملجاتا ہے تو اپنی فکر و تدبر سے اسمیں تصرف کرکے ایک نئی چیز بنا لیتے ہیں جو پہلے نہ تھی یہاں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مادہ نہ اپنی ذات سے کوئی کام کرسکتا ہے نہ اس کو عقل و شعور ہے باوجود اس کے انھوں نے یہ مان لیا کہ بنانیوالے کی کوئی ضرورت نہیں صرف مادہ سب کچھ کر لیتا ہے مادہ جمع ہو کر زمین بنگیی پانی بنگیا ہوا ہوگئی آگ بنگئی جمادات حیوانات اور تمام کائنات خود بخود بنگئی اور ہزاروں سیکڑوں چیزیں بنتی جاتی ہیں۔

اگر اہل اسلام قرآن و حدیث کی کوئی بات ان سے کہتے ہیں جو ان کی معمولی عقلوں میں نہیں آتی تو فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم جب تک مشاہدہ نہ کرلیں گے ایسی باتوں پر ایمان نہ لائیں گے اب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ اس عالم کی روزمرہ کی وہ چیزیں جنکو ہم استعمال کرتے ہیں اور اپنی قوت صنعت و حرفت سے نئی نئی وضع کی تیار کرتے ہیں ایا خود بخود بنجاتی ہیں؟ اور کوئی مصنوع ایسا بھی ممکن ہے جو بغیر کسی کے

بنائے بن گیا ہو۔ ایسا تو ہرگز ہو نہیں سکتا جب ادنی ادنی چیزوں کا
یہ حال ہے تو کائنات کی بڑی بڑی مخلوقات کیونکر خودبخود بن گئی ہونگی
مشاہدہ کے خلاف اُن کی عقلوں نے کسطرح تسلیم کر لیا کہ تمام عالم خودبخود
بغیر کسی خالق ذی شعور کے بنگیا ہے اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے
دیہاتی بیوقوف نے برقی روشنی کے ہزارہا چراغوں کو خودبخود روشن
ہوتے دیکھا اور روشن کرنیوالا اُس کو نظر نہ آیا تو اُس کے سادہ ذہن نے
یہ نتیجہ نکالا کہ جب رات ہوتی ہے تو یہ سب چراغ خودبخود روشن ہو جاتے
ہیں اب اُس سے ہزار کہے کہ بھائی یہ برقی روشنی ہے تم برق کی قوتوں
اور کرشموں سے ناواقف ہو یہ سب چراغ برقی قوت سے روشن ہوتے
ہیں اور ایک شخص اُن کو روشن کرنیوالا ہوتا ہے جو ایک خفیف سی
حرکت سے سب کو آنِ واحد میں روشن کر دیتا ہے مگر اُس سادہ لوح کے ذہن
میں یہ بات نہ آئے گی اور وہ ہرگز باور نہ کرے گا یہی کہے جائے گا کہ
اگر یہ بجلی ہے تو اُس کی گرج کہاں ہے ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ بجلی چمکے
اور اُس کی گرج نہ ہو اگر دوری کیوجہ سے اُس کی آواز نہ سنی جائے تو یہ بات
اور ہے مگر جہاں چمکتی ہے وہاں تو آواز ضرور ہوتی ہے پھر اگر یہ بجلی ہے
تو اُس کی روشنی پوری تار میں کیوں نہیں ہوتی اور وہ تار گرم کیوں نہیں
ہوتا اور چراغ کی طرح وہ بھی روشن کیوں نہیں نظر آتا اور جن لکڑیوں سے

وہ متعلق ہے وہ کیوں نہیں جلجاتیں۔ کیا اس احمق کے یہ دلائل عقلمندوں کے نزدیک قابل التفات ہو سکتی ہیں ہرگز نہیں عقل والے یہی سمجھیں گے کہ وہ بے وقوف معذور ہے اس کی کمزور عقل اس قابل نہیں کہ مسئلہ برق کو سمجھ سکے مگر عقلا فوراً مان جائیں گے اور بحسب مدارج عقل برق کی طاقتوں اور کرشموں کے قائل ہوجائیں گے اور کم از کم اتنا تو ضرور کہیں گے کہ گو ہمیں اس کی حقیقت معلوم نہ ہو اور کسی قسم کی حرکت سے وہ روشنی ہوتی ہے اور اس حرکت میں اور روشنی میں کیا مناسبت ہے گو ہم نہ سمجھ سکتے ہوں مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ کوئی شخص ضرور ہے جو ایک خاص قسم کی صنعت اور حرکت سے اُن تمام چراغوں کو روشن کیا کرتا ہے یعنی متحرک اور منور کے وجود کے وہ ضرور قائل ہوجائیں گے اہل ایمان بھی سمجھتے ہیں کہ جس طرح اُس جنگلی کی سمجھ قاصر ہے اور سمجھ نہیں سکتا کہ صرف ایک حرکت سے ہزاروں چراغ کیونکر روشن ہوجاتے ہیں اسیطرح ہماری سمجھ اس بات سے قاصر ہے کہ خداوند تعالے ایک لفظ کُنْ سے تمام مخلوقات کو کیونکر پیدا کر دیتا ہے اور جسطرح عقلا تسلیم کر لیتے ہیں کہ ایک ادنٰی حرکت سے ہزاروں چراغ کا آن واحد میں روشن ہوجانا کوئی خلاف عقل نہیں اسی طرح وہ عقلا جن کو دین کی عقل ہے اور ہمیشہ قرآن وحدیث کے مضامین میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں اُن کو صاف طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ

بیشک جس چیز کو حق تعالیٰ پیدا کرنا چاہتا ہے ایک امر کنْ سے پیدا کر دیتا ہے یعنی اس کو ارشاد ہوتا ہے کہ ہو جا وہ فوراً پیدا ہو جاتی ہے اُن کو اس بات کا عقل سے بھی یقین حاصل ہوتا ہے کہ جسطرح خداوند تعالیٰ کا وجود کسی کا محتاج نہیں خود بخود اُس کا وجود ہے اسیطرح وہ اپنے افعال میں بھی کسیکا محتاج نہیں ہے اُس کو نہ مادہ کی ضرورت ہے نہ آلات و اوزار سے مدد لینے کی اگر ایسا نہ ہو تو پھر بندہ اور خالق میں فرق ہی کیا ہوا بندہ بھی بغیر مادہ کے کوئی چیز بنا نہیں سکتا اور خالق بھی بغیر مادہ کے نہ بنا سکا خالق کے افعال کو بندوں کے افعال پر قیاس کرنا خالق کی بیقدری کرنی ہے۔ اگر ب[illegible]قی روشنی میں کامل طور پر فکر کیجائے تو بہت سے دینی مسائل کا کامل ثبوت مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ ایمانی نظر سے دیکھیں اگر حق تعالیٰ توفیق دے تو کسی مقام میں اس سے متعلق اور بھی کچھ لکھا جائے گا حق تعالیٰ ہمیں ایمانی نظر عطا فرمائے تاکہ ہر چیز سے فائدۂ اخروی اور دنیوی حاصل کر سکیں۔